تذکرۂ شیخ دولا گجراتی

تصنیف

محمد چراغ بن شاہ مراد گیلانی قادری

فارسی سے اردو ترجمہ

ڈاکٹر عصمت درّانی

مقدّمہ، ضمیمہ واہتمام

ڈاکٹر عارف نوشاہی

المیر ٹرسٹ لائبریری و مرکز تحقیق و تالیف، گجرات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ شیخ دولا گجراتی

تصنیف

محمد چراغ بن شاہ مراد گیلانی قادری

فارسی سے اردو ترجمہ

ڈاکٹر عصمت درّانی

مقدمہ، ضمیمہ و اہتمام

ڈاکٹر عارف نوشاہی

المیر ٹرسٹ لائبریری و مرکز تحقیق و تالیف، گجرات

۲۰۱۶ء

سلسلہ مطبوعات ''پنجاب میں فارسی ادب'' - ۴

زیر نگرانی

ڈاکٹر عارف نوشاہی

۱۔مثنوی گلزار محبت، محمد اکرم غنیمت کنجاہی، مرتبہ عارف نوشاہی، ۲۰۰۸ء

۲۔رسائل غنیمت کنجاہی (رقعات غنیمت و مناظرۂ گل و نرگس)، مرتبہ عارف نوشاہی، ۲۰۰۹ء

۳۔غنیمت کنجاہی: محمد اکرم غنیمت کنجاہی کے احوال و اشعار اور تصانیف پر منتخب مقالات کا مجموعہ، مرتبہ نجم الرشید و محمد صابر، ۲۰۰۹ء

۴۔تذکرۂ شیخ دولا گجراتی، محمد چراغ بن شاہ مراد گیلانی قادری، مترجمہ: عصمت درّانی، مقدمہ: عارف نوشاہی، ۲۰۱۶ء

تذکرۂ شیخ دولا گجراتی

ناشر: عارف علی میر ایڈووکیٹ، فیاض احمد

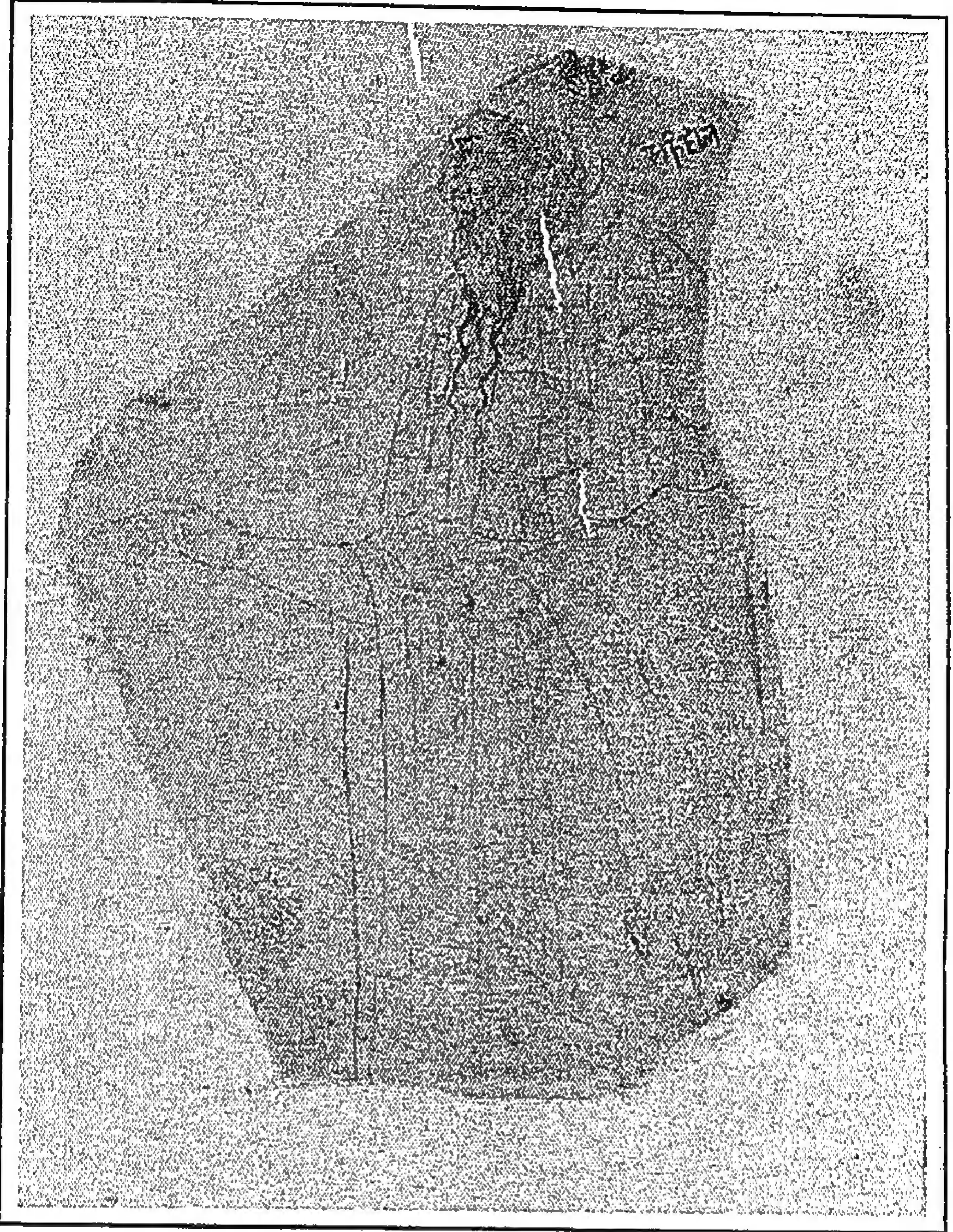
المیر ٹرسٹ لائبریری و مرکز تحقیق و تالیف،

میر سٹریٹ، بھمبر روڈ، گجرات (پاکستان)

سال طباعت: ۲۰۱۵ء/۱۴۳۶ھ

تاریخ اشاعت (اوّل): ۲۹ جنوری ۲۰۱۶ء/۱۴۳۷ھ

یہ کتاب حسب روایت، غضنفر حسین میر (وفات: ۲۹ جنوری ۱۹۹۶ء) کی یاد میں شایع کی گئی جو تمام اہل علم حضرات اور کتب خانوں کے لیے بلا قیمت ہے۔ کتاب سے استفادہ کرنے والوں سے المیر ٹرسٹ لائبریری کے کارپردازان اور مرتبین کے لیے خیر و برکت اور صحت و عافیت کی دعا کی درخواست ہے۔ ناشر اور مرتبین، سید اویس علی سہروردی (اورینٹل پبلی کیشنز، لاہور) کی طرف سے بعض سہولیات فراہم کرنے پر بھی ممنون ہیں۔



شیخ دولا گجراتی کی خیالی شبیہ

Portrait of a Bearded Man (Shah Doula)
Indian, 18th century
Mughal period, 932-1274/1526-1858
Black pen on deer skin (charbah)
10.7 x 8.2 cm (4 3/16 x 3 1/4 in.)
Harvard Art Museums
Department of Islamic & Later Indian Art, Division of Asian and Mediterranean Art

اعتراف

ایک زبان کی روح کو دوسری زبان کے قالب میں منتقل کرنا، جسے ہم علمی اصطلاح میں ''ترجمہ'' کہتے ہیں، خاصہ مشکل کام ہے، لیکن اگر وابستگی اور وارفتگی ہو تو یہ مشکل کام، قدرے آسان ہو جاتا ہے۔ مجھے ہمیشہ سے ہی ترجمہ کے کام سے رغبت رہی ہے اور کسی بھی فارسی تحریر کو اردو میں منتقل کرنا میرے لیے غیر معمولی دلچسپی کا حامل رہا ہے۔ میں خود کو اس حوالے سے خوش قسمت تصور کرتی ہوں کہ مجھے ستمبر ۲۰۰۸ء میں اپنے علمی سفر کے آغاز ہی سے ڈاکٹر عارف نوشاہی صاحب جیسے نامور محقق اور عالم کی رہنمائی میسر آئی، جنہوں نے مجھے اپنی علمی سرپرستی میں لیا تو پہلی نصیحت یہ کی:

> ''اگر محقق بننا ہے تو محمود شیرانی، مولوی محمد شفیع کے مقالات پڑھیں، اگر نقاد بننا چاہتی ہیں تو سید عبداللہ اور وحید قریشی [کی تحریریں] پڑھیں۔ یہ ہمارے علاقے کے اور اپنی زبان میں لکھنے والے ہیں۔ فارسی کا اسلوبِ تحقیق سیکھنا اگلی منزلِ سلوک ہے، اس کا سبق پھر کبھی سہی۔''

چنانچہ ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۸ء کو ڈاکٹر صاحب نے اپنے تحریر کردہ دو فارسی مقالے اردو ترجمہ کے لیے مجھے بھیجتے ہوئے اگلی نصیحت یہ کی:

> ''تحقیق کا کام ہمیشہ ترجمہ سے شروع کر کے آسانی ہوتی ہے۔ اس لیے میں نے آپ کو فی الحال اس کام پر لگایا ہے۔ بہت جلد خود تحقیق کی منزل شروع ہو گی تو ترجمے کا کام آپ کو کچے راستے پر چلنا معلوم ہو گا، جیسے موٹر وے پر چڑھنے کے لیے پہلے آپ کو معمولی شاہراہوں سے گذرنا ہوتا ہے۔ میں نے اپنا سارا کام ترجمے سے شروع کیا تھا۔ اخباری کالم، مقالے، کتب، سب کچھ ترجمہ کیا لیکن اب وہ کام بہت پیچھے رہ گیا ہے۔''

اس نصیحت کو اپنے لیے کامیابی کا گُر اور اس ذمہ داری کو اعزاز جانتے ہوئے اپنی علمی زندگی کے یہ اولین تراجم میں نے نہایت دلجمعی اور شوق سے چند دنوں میں ہی مکمل کر لیے، لیکن مسترد ہونے کے خوف اور ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کی سنجیدگی، رعب اور دبدبے نے یہ تراجم ان کی خدمت میں پیش کرنے سے ایک سال تک روکے رکھا، بالآخر جب ہمت جُتا کر، ڈرتے ڈرتے انہیں یہ تراجم دکھائے تو انہوں نے حوصلہ افزائی کے طور پر جو ستائشی الفاظ کہے، وہ میرے اس مختصر علمی سفر کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ یہ دونوں مقالے بعد ازاں مجلّہ ''معیار''☆ میں شائع ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب کی طرف سے، جنوری ۲۰۱۰ء میں تذکرۂ شیخ دولا گجراتی کے فارسی سے اردو

ترجمے کے لیے میرا انتخاب بھی ان کی اسی حوصلہ افزائی اور شاید اعتماد کی دلیل تھا۔ میں نے فنِ ترجمہ سے اپنی وارفتگی کی حد تک دل چسپی کی بنا پر، یہ کام بھی بہت جلد مکمل کرلیا۔ یہ میرا کسی قدیم فارسی متن کے ترجمے کا پہلا تجربہ تھا۔ اس سے قبل میں نے جدید فارسی میں لکھے گئے مضامین ترجمہ کیے تھے۔

یوں تو ہر زبان کے مترجم کو کچھ مشکلات کا سامنا کرنا ہوتا ہے، لیکن ہند و پاک کی قدیم فارسی کے مترجم کے لیے کچھ مخصوص مشکلات ہیں اور ذرا سی بے احتیاطی ترجمے کو غیر حقیقت پسندانہ بنا دیتی ہے۔ میرا واسطہ بھی بار ہا ان مشکلات سے پڑا لیکن مجھے میسر راہنمائی وہ نعمت غیر مترقبہ تھی جس نے ان مشکلات کی کوئی پیش نہ چلنے دی۔ ویسے بھی کہا جاتا ہے کہ مسافر کو راہ کی سختیوں کا گلہ کرنا روا نہیں ہے۔ ایک اہم بات جو ڈاکٹر صاحب نے ترجمہ کے اصول کے طور پر بتائی، یہ تھی کہ ترجمہ کرتے وقت، متن کے قریب تر اور اس کا پابند رہنا چاہیے۔ چنانچہ میں اس ترجمے میں حتی الوسع متن کے قریب تر رہی ہوں۔ میں نے اس تذکرے کے ترجمے کے دوران یہ بات بھی سیکھی کہ ایک مترجم کو اپنا کام پیشہ ورانہ ذمہ داری سمجھ کر مکمل ایمان داری اور غیر جانبداری سے انجام دینا چاہیے، خواہ اسے مندرجات اور مصنف کے خیالات سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔

میں ترجمے کے اصول وضوابط اور فنی باریکیوں سے قطعاً نابلد ہوں، لیکن میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اچھے ترجمے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ پڑھتے وقت اس پر ترجمے کا نہیں، اصل کا گمان ہو۔ لہذا یہ اصول ہمیشہ کے لیے اپنی گرہ میں باندھ لیا۔ ڈاکٹر صاحب کا اس تذکرے کے ترجمہ کی روداد بیان کرتے ہوئے یہ لکھنا کہ 'یہ ترجمہ زبان و بیان کی روانی کے باعث ترجمہ نہیں، اصل معلوم ہوتا ہے' اس بات کی گواہی ہے کہ میں اپنی محنت کے اجر سے محروم نہیں رہی ہوں۔ میری اس خوش گمانی کی تصدیق یا تردید قارئین کرام ہی کریں گے۔

یوں بفضلہ تعالیٰ مقالے سے کتاب کے ترجمے تک کا یہ سفر، ڈاکٹر نوشاہی صاحب ہی کے ایما، مشاورت اور راہنمائی سے طے پایا۔ مجھے یہاں بس یہی اعتراف کرنا تھا۔

عصمت درّانی

بہاول پور، ۵ مارچ ۲۰۱۵ء

☆

۱۔ ''برصغیر میں ایرانی مطالعات اور تحقیق متن کے مباحث''

مجلّہ ''معیار''، شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، شمارہ ۱، دسمبر ۲۰۰۹ء

۲۔ ''برصغیر پاک و ہند میں فارسی متون کی ترتیب و تدوین اور احیاء''

مجلّہ ''معیار''، شمارہ ۳، جون ۲۰۱۰ء

فہرست مضامین

مقدمات

تذکرہ شیخ دولا گجراتی

اشاریہ

روئیداد ترتیب و ترجمہ

یہ ۱۹۹۷ء کی بات ہے؛ میں مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد کے شعبۂ تحقیقات سے وابستہ تھا۔ وہاں میرا کام ایسی فارسی کتب کا انتخاب کرنا تھا جنھیں مرتّب کر کے مرکز کی طرف شایع کیا جائے۔ اسی سال اتفاق سے پاکستان کے استقلال اور قیام کا جشن طلائی بھی تھا۔ مرکز اس موقع پر کتابوں کا ایک سلسلہ شایع کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اس کے لیے مکلّف کیا گیا تو میں نے اپنی صوابدید سے ایسی کتب کا انتخاب کیا جن کی جڑیں پاکستان میں تھیں، یعنی ان کتب کے مصنّفین ان علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں جو اَب پاکستان کا حصّہ ہیں اور ان کا موضوع بھی اسی تہذیب اور سرزمین سے متعلق ہے۔ ان منتخب کتب میں ایک، پنجاب کے صوفی بزرگ حضرت شیخ دولا گجراتی، جنھیں عرفِ عام میں ''شاہ دولا'' کہا جاتا ہے، کا فارسی تذکرہ از محمد چراغ بن شاہ مراد گیلانی قادری بھی تھا۔ اتفاق سے اس کا ایک قلمی نسخہ خود مرکز کے کتب خانہ '' گنج بخش'' (شمارہ 2678) میں موجود تھا۔ پنجاب ہی کے ایک محقق ، ڈاکٹر گوہر نوشاہی صاحب کو اس تذکرے کی ترتیب وتدوین کا کام سونپا گیا۔ انھوں نے اسے گنج بخش اور شریف کنجاہی (م: ۲۰۰۷ء) کے مملوکہ نسخوں کی مدد سے مرتّب کردیا۔ جب وہ اپنا کام مکمل کر کے لائے تو اشاعت سے پہلے ''نگاہ آخر'' کے طور پر مرکز کے مسؤلین نے اسے دیکھا۔ مسؤلین کی خیال میں اس تذکرے میں ایک واقعہ یا کرامت، اسلامی اور اخلاقی شئون کے منافی ہے، جس کی موجودگی میں اس

تذکرے کی اشاعت مناسب نہ تھی۔ فاضل مرتّب سے مشورہ کیا گیا کہ اس واقعے کو نکال دیا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ بجائے پورا واقعہ حذف کرنے کے صرف قبیح الفاظ نکال دیے جائیں تاکہ کتاب کی اصالت برقرار رہے۔ لیکن مرکز کے مسئولین کا اصرار پورا واقعہ نکالنے پر تھا۔ اسی بحث میں جشن طلائی کا سال گذر گیا، مرکز کی انتظامیہ بھی بدل گئی اور یوں اس تذکرے کی اشاعت کا معاملہ داخل دفتر ہو گیا۔

۲۰۰۰ء میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی صاحب نے اسے اپنے طور پر شایع کرنے کا ارادہ کیا اور مجھ سے مقدّمہ لکھنے کی فرمائش کی، جو پوری کردی گئی، لیکن بوجوہ تذکرہ شایع نہ ہو سکا۔

۲۰۰۸ء میں مرکز تحقیق المیر ٹرسٹ لائبریری، گجرات کے مہتمم عارف میر صاحب ایڈووکیٹ نے اپنے ادارے کی طرف سے اشاعتی سلسلے میں مجھ سے مشاورت کی تو میں نے انھیں پنجاب میں فارسی ادب کے حوالے سے کتب شایع کرنے کا مشورہ دیا۔ میں نے جن کتب کا انتخاب کیا ان میں محمد چراغ کا ''تذکرۂ شیخ دولا'' مرتّبہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی بھی شامل تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ اس تذکرے کا فارسی متن مع اردو ترجمہ و مقدّمہ شایع کیا جائے گا۔ اردو ترجمے کے لیے ڈاکٹر عصمت درّانی، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ فارسی، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور سے درخواست کی گئی اور انھیں گوہر صاحب کا مرتّبہ فارسی متن مہیا کیا گیا۔ انھوں نے بڑی محنت سے اس کا ترجمہ کیا۔ اس ترجمے کو مطابقِ اصل جانچنے کے لیے، میں نے اسے گوہر صاحب کے مرتّبہ متن سے ملا کر پڑھا۔ اس دوران معلوم ہوا کہ گوہر صاحب کے مرتّبہ متن میں کہیں کہیں سہو اور اشکالات ہیں۔ کچھ کا تعلق متن کی درست قرائت نہ ہونے سے تھا اور کچھ کا تعلق کتابت سے۔ گوہر صاحب سے درخواست کی گئی کہ وہ اصل قلمی نسخوں

سے ٹائپ شدہ متن ملا کر یہ اشکالات رفع کر دیں تا کہ ان کے نام سے چھپنے والا تذکرہ، قرائت متن کی اغلاط سے پاک ہو۔ لیکن وہ اپنی گوناگوں مصروفیات کی بناء پر ایسا نہ کر سکے۔ ناچار موجودہ اشاعت میں فارسی متن سے صرفِ نظر کیا گیا ہے اور محض اس کا اردو ترجمہ شامل کیا گیا ہے۔ میں نے اردو ترجمے کو اصل سے ملانے کے لیے، "تذکرے کا قلمی نسخۂ گنج بخش، اگست ۲۰۱۳ء میں ایک بار پھر دیکھا اور گوہر صاحب کے مرتّبہ متن کے اشکالات والے مقامات کو اس نسخہ کی مدد سے حل کر لیا۔

میں ڈاکٹر عصمت کا ممنون ہوں کہ انھوں نے بڑے شوق سے یہ کام کیا۔ یہ ان کا کسی پرانے فارسی متن کا اردو ترجمہ کرنے کا پہلا تجربہ تھا۔ ایک ایسا متن، جس میں اسلامی معارف اور تصوّف کی کچھ اصطلاحات بھی ہیں اور کہیں کہیں فارسی زبان، مقامی رنگ لیے ہوئے ہے؛ ترجمے میں مشکلات کا پیش آنا فطری امر تھا۔ میں نے ڈاکٹر صاحبہ کی ہمت بندھائی اور انھیں کام پر مستعد رکھا۔ اب یہ ترجمہ آپ کے سامنے ہے جو زبان و بیان کی روانی کے باعث ترجمہ نہیں، اصل معلوم ہوتا ہے۔ یہ ترجمہ متن سے بہت قریب تر ہے اور اس میں متن سے کسی قسم کا انحراف نہیں کیا گیا، سوائے اس ایک حکایت کے جو غیر اخلاقی اور غیر فطری تھی، اس کا ایک حصّہ حذف کر دیا گیا ہے۔

کتاب کو علمی معیارات کے مطابق رکھنے کے لیے کچھ مزید اہتمام بھی کیے گئے ہیں۔ مفید عام اشاریے تیار کیے گئے ہیں۔ اشعار کی تخریج بھی کر دی گئی ہے۔ ہمیشہ کی طرح یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ ہمارے متون میں نقل شدہ اشعار، زمانۂ حال میں شعری متون کے تنقیدی ایڈیشنوں سے جزوی اختلاف رکھتے ہیں۔ یہی بات اس تذکرے میں درج اشعار پر بھی صادق آتی ہے۔ لیکن ہم نے ان

اشعار کو اسی طرح رہنے دیا ہے جیسے مصنّف نے درج کیے ہیں اور انھیں تنقیدی ایڈیشنوں کے مطابق بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تا کہ مصنّف کی روایت برقرار رہے۔ چند ایک اشعار کی تخریج نہیں ہو سکی۔ کچھ اشعار کی تخریج میں محبّی ڈاکٹر معین نظامی (لاہور) اور ڈاکٹر حکیم آزر (ایران) نے ہمیشہ کی طرح راہ نمائی اور گرہ گشائی فرمائی، جس کے لیے ان کا ممنون ہوں۔

مصنف نے تذکرے کے اندر سوائے ایک دو مقامات کے، کہیں بھی مضامین کی سرخیوں کا التزام نہیں کیا اور ہر نیا واقعہ ''نقل است'' لکھ کر درج کیا ہے۔ ترجمے کے دوران نفس مضمون کے مطابق اس کا عنوان لکھ دیا گیا ہے اور اسی کے مطابق شروع میں فہرست مضامین بھی تیار ہوئی ہے۔ اس سے قارئین کو مضامین تلاش کرنے میں سہولت ہو گی۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی صاحب اپنا مرتّبہ فارسی متن تو شایع نہ کر سکے، لیکن انھوں نے تذکرے اور اس کے مصنّف کے بارے میں ایک مضمون ''سوانح حضرت شاہ دولہ: ایک معاصر دستاویز''، رسالہ دریافت (نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز)، اسلام آباد، شمارہ ۷، سال ۲۰۰۸ء، صفحات ۴۶ - ۵۹ میں شایع کیا تھا، جس میں کتاب، مصنّف اور شیخ دولا کے بارے میں بہت مفید اور اہم باتیں آ گئی ہیں۔ اسی لیے یہ مضمون بلا کم و کاست (کتابت کی اغلاط درست کر کے) شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ تذکرہ، مصنّف اور صاحبِ تذکرہ کے بارے میں چند ایک اضافی معلومات، جو مجھے حاصل تھیں، ان کا ایزاد میں نے اپنے الگ مقدّمہ میں کر دیا ہے۔

اس ترجمے میں صاحبِ تذکرہ کے نام کا املاء ''دولہ'' کی بجائے ''دولا'' اختیار

کیا ہے۔ اس کی وضاحت میرے مقدمہ میں موجود ہے۔ البتہ ایسے فارسی یا اردو اقتباسات، جو دوسرے مصنّفین کے ہیں، اگر انھوں نے "دولہ" لکھا ہے، تو اسے بجنسہٖ رکھا ہے۔

عارف نوشاہی



ڈاکٹر عارف نوشاہی

مقدّمہ

چند قدیم فارسی مآخذ میں شیخ دولا گجراتی کا ذکر:

زیر نظر تذکرے میں شیخ دولا گجراتی کی تاریخ وفات ۱۵ ربیع الاوّل، ۱۰۸۶ھ [۳۰ مئی، ۱۶۷۵ء] درج ہوئی ہے اس مناسبت سے شیخ کی وفات سے کوئی ایک سو سال بعد تک تصنیف ہونے والی چند فارسی کتب کے اقتباسات، تاریخی اور زمانی ترتیب سے پیش خدمت ہیں جن میں شیخ دولا گجراتی کا ذکر موجود ہے۔ ان میں کچھ کتب کے مصنّفین نے شیخ سے ملاقات کی تھی یا ان کا زمانہ پایا تھا۔ شیخ کی وفات سے بعد تصنیف ہونے والی کتب میں درج اطلاعات کی روایت بھی ایسے لوگوں سے ہے جو شیخ کے ہم عصر تھے۔ اس لیے یہ تمام مآخذ مستند ہیں اور شیخ کی سوانح نگاری میں کارآمد ہیں۔

جہان آرا بیگم: صاحبیہ (تصنیف: ۱۰۵۱ھ/ ۱۶۴۱ء)

شہزادی جہان آرا بیگم بنت شاہ جہان نے ۲۷ رمضان ۱۰۵۱ھ/ ۱۶۴۱ء کو حضرت شاہ بدخشی کے حالات میں رسالہ صاحبیہ لکھا ہے۔ اس رسالے میں موصوفہ نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ اس کے بھائی شہزادہ محمد دارا شکوہ (۱۰۲۴-۱۰۶۹ھ/ ۱۶۱۵-۱۶۵۹ء) دار السلطنت سے کابل جا رہے تھے تو راستے میں دو بزرگوں سے

ملاقات کی۔ان میں سے ایک شیخ دولا گجراتی تھے۔اس ملاقات کا احوال بزبان داراشکوہ:

"یکی ازین ہا شیخ دولہ بودند کہ در قصبۂ گجرات خُرد سکونت دارند۔۔۔ چون بہ گجرات رسیدم خواجہ سرای را با نیاز نزد شیخ دولہ فرستادم و اظہار اخلاص نمودہ التماس فیضی نمودم کہ از ایشان بہ من رسد۔لیکن آنچہ می خواستم از ایشان نیافتم۔" (جہان آرا بیگم، ص ۲۰)

ترجمہ: ان میں سے ایک شیخ دولہ تھے، جو چھوٹے گجرات میں رہتے ہیں؛ میں جب گجرات پہنچا تو ایک خواجہ سرا کو نیاز دے کر شیخ دولہ کے پاس بھیجا اور اظہار عقیدت کرتے ہوئے ان سے درخواست کی کہ مجھے بھی فیض پہنچائیں۔لیکن میں جو چاہتا تھا وہ ان سے نہ ملا۔

محمد بختاور خان: مرآۃ العالم (عرصۂ تصنیف ۱۰۷۸-۱۰۹۴ھ/ ۱۶۶۷-۱۶۸۳ء)

محمد بختاور خان (حدود ۱۰۳۰-۱۰۹۶ھ/۱۶۲۱-۱۶۸۵ء)، عالمگیری عہد کے عہدہ داروں میں سے تھے۔وہ کئی کتب کے مصنف ہیں۔عالمگیر کے ابتدائی دس سالہ دور حکومت کے واقعات پر ان کی تصنیف مرآۃ العالم موجود ہے جو ۱۰۷۸ھ/۱۶۶۷ء میں لکھی گئی لیکن اس پر ۱۰۹۴ھ/۱۶۸۳ء تک اضافے ہوتے رہے۔اس میں شیخ دولا گجراتی کا ذکر موجود ہے:

"شیخ دولای گجراتی، بخدمت مخدومی میان سیدا نام فایض شدہ و از نوال او بہرۂ وافی یافت و از مشاہیر آفاق گشت۔خُرد و بزرگ سکنۂ

پنجاب را بہ او طرفہ اعتقادی است و خوارق بسیاری از و منقول و مردم کثیر از مطبخ او راتبہ خوار اند و باوجود عدم اسباب دخل، خرج بسیار داشت و اقسام وحوش و اصناف طیور گرد او جمع آمدہ و فیل و شتر و شیر و ببر و دیگر جانوران فراہم آوردہ، راتبۂ آنہا مہیا داشت و عمارات عالی ساختہ و مابین گجرات و لاہور پل طولانی احداث نمود۔" (بختاور خان، ج ۲، ص ۴۱۹)

ترجمہ: شیخ دولا گجرات میں میرے مخدوم میاں سیدا کی خدمت سے فایض ہوئے اور ان سے خوب استفادہ کیا۔ مشاہیر عالم میں ان کا شمار ہوا۔ پنجاب کا ہر چھوٹا بڑا ان کا خوب معتقد ہے۔ آمدنی کے ذرایع معدوم ہونے کے باوجود، خوب خرچ کرتے تھے۔ بہت سے لوگ ان کے مطبخ کے وظیفہ خوار تھے۔ قسم قسم کے جنگلی جانور اور پرندے ان کے پاس جمع ہو گئے تھے۔ ہاتھی، اونٹ، شیر، ببر اور دوسرے جانور موجود تھے۔ ان کی خوراک مہیا رکھتے تھے۔ انھوں نے عالی شان عمارتیں بنوائیں۔ لاہور اور گجرات کے درمیان ایک لمبا پل بنوایا۔

اسی مصنف نے اپنی ایک دوسری تصنیف **آیینۂ بخت** (سال تصنیف: ۱۰۷۸ھ، اضافات تا ۱۰۸۸ھ/ ۱۶۶۷ء-۱۶۷۷ء) میں قریب قریب مرآۃ العالم کے الفاظ ہی کو دہرایا ہے اور آخر میں ایک نئے جملے کا اضافہ کیا ہے:

"اگر چہ بہ ادراک سعادت ملازمت مقدس مشرف نگشتہ لیکن از انعام والا بہرہ مند و فیض یاب است۔" (ص ۶۱۵)

ترجمہ: [شاہ دولا] اگرچہ [اورنگ زیب کی] ملازمت کی سعادت سے مشرّف نہیں ہوئے، لیکن [ان کے] انعام والا سے فیض یاب اور بہرہ مند ہیں۔"

اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاہ دولا کتاب کی تصنیف کے وقت ہنوز زندہ تھے۔

عبدالفتاح بن میر محمد نعمان بدخشی: مفتاح العارفین (تصنیف حدود ۱۰۹۲ھ/۱۶۸۱ء)

مصنف، حضرت مجدّد الف ثانی کے نامور خلیفہ میر محمد نعمان کے خلف ہیں۔ انھوں نے مشائخ اور علماء کے حالات پر یہ تذکرہ لکھا ہے۔ شاہ دولا گجراتی کے حالات قدرے تفصیل سے دیے ہیں۔ کچھ باتیں نئی ہیں جیسے شاہ دولا کا "ہندو پسر" ہونا جو خلاف واقع ہے۔ پوری عبارت یہ ہے:

"شاہ دولا گجراتی، کہ از مضافات لاہور است، دراصل ہندو پسر بود۔ در ایام صبی وی را داعیۂ این راہ پیدا شد۔ [بہ] سیالکوٹ رفت۔ در خدمت شیخ نصیر الدین بہاری کہ مجذوبی بود با معنی و در خدمت شیخ شمس الدین پدر مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نیز رسیدہ و مدت ہا پیش وی بودہ و مقبول وی گردیدہ۔ شاہ دولا گوید: "اُس نے ہک اُکھر مجھو آکھا" یعنی وی یک حرف مرا گفت۔ پس ازان در خدمت شاہ شیدا سیالکوٹی، کہ ہم مجذوب بود، صاحب کرامت رسیدہ و از نوال او بہرۂ وافی چیدہ، از مشاہیر آفاق گشتہ۔ و شاہ شیدای مذکور را فرزندان و

طالبان و مریدان بوده و بر قدرِ استعداد بہ ہر کدام بہرہ می رسید۔ اما نعمت خود بہ کسی عطا نمی فرمود۔ تا وقتِ وی بہ آخر رسید و مختصر گردید و خواست کہ بہ یکی از منشیان کارکردۂ قدیمی خود دولت و نعمت عطا کند۔ آواز داد کہ بر در کیست؟ غیر از دولا ہیچ کس حاضر نبود۔ گفت: ''منم دولا'' [در نسخہ: منم اولا]۔ شیدا خاموش شد۔ بعد از ساعتی باز آواز داد۔ باز دولا جواب داد۔ کرت سوم چون دید کہ وقتش نزدیک رسیدہ و از یاران قدیم کسی حاضر نیست باز گفت: ''بیا، جسے دی تسے مولا'' نزد خود طلبید۔ جبّہ و کوزہ و کاسۂ خود بہ وی عطا فرمود و از دنیا برفت۔ ہم در آن زمان وی را حالی از جذبۂ خاص روی داد۔ چون ازین معنی متعلقان شیدا واقف شدند، شیدا وار بہ وی آویختند کہ جبّہ و گودری شاہ از وی بگیرند، نتوانستند گرفت۔ و دولا از آنجا بہ گجرات مُرد و در ناحیت آن شہر برای خود نشیمن گاہ ساخت۔ در اندک مدّتی تصرفات وی مشہور شد۔ زمینی را بکند و خشتہا و سنگہا از آنجا برآوردہ، بہ کار بُرد۔ و زمین دیگر بکندو از آنجا بیلی برآورد و پلی عالی طولانی در کنار شہر بر رہگذرات ساخت کہ مسافران کابل و کشمیر بالای او شدہ بہ ہندوستان آمد و رفت دارند۔ و در آن وادی باغی ساخت بس تازہ و سیراب۔ و جانوران بسیار از ہر جنس جمع کردہ مثل آہو و شیر و بز کوہی و گوزن و گورخر و پلنگ و گرگ و خرس وغیر ذلک۔ و طیور متعارف محبوس۔ خبر آنہا می گرفت و می گفت کہ از مصاحبت مردمان این زمانہ، موانست با حیوانات بسیار خوش می آید۔ و رعایت فقرا و

مساکین و بعضی لشکریان بی سروسامان کردن گرفت۔ و ہر کہ پیش وی می شد شیرینی و یا طعام پیش می آورد۔ و خوارق عادات از وی بہ ظہور می رسید و ہر روز شہرت وی زیادہ تر می شد۔ تا عمرش بہ یک صد و دہ سال رسید در سنہ ہزار و ہشتاد و پنج رحلت کرد و قبرش در جایی کہ می بود، در گجرات لاہور است۔" (ورق ۲۵۵ ب)

ترجمہ: "شاہ دولا گجرات کے، جو مضافات لاہور میں ہے۔ وہ دراصل ہندو بچہ تھے۔ بچپن میں انھیں راہ سلوک کی خواہش ہوئی تو سیالکوٹ گئے اور وہاں شیخ نصیر الدین بہاری، جو صحیح معنوں میں مجذوب تھے، کی خدمت میں پہنچے۔ وہیں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے والد شیخ شمس الدین کی خدمت میں بھی گئے اور مدتوں ان کے ہاں رہے اور ان کے پسندیدہ تھے۔ شاہ دولا کہتے ہیں: "اُس نے ہک اَکھر مجھوآ کھا" یعنی انھوں نے ایک بات [نصیحت] مجھے کہی۔ اس کے بعد شاہ شیدا سیالکوٹی کی خدمت میں گئے۔ وہ بھی مجذوب اور صاحبِ کرامت تھے۔ ان کے خوان سے بہت فیض پایا اور دنیا میں مشہور ہو گئے۔ شاہ شیدا کے کئی فرزند، طالب اور مرید تھے۔ ہر کسی کو اس کی قابلیت کے مطابق حصّہ مل جاتا تھا۔ خود کسی کو کچھ نہیں دیتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کا آخری وقت قریب آ گیا اور [زندگی کی] مہلت کم رہ گئی۔ تب انھوں نے چاہا کہ اپنے ایک قدیم کارگزار منشی کو [باطنی] دولت اور نعمت عطا کر دیں۔ آواز دی: "دروازے پر کون ہے؟" شیخ دولا کے

علاوہ کوئی حاضر نہ تھا۔ انھوں نے کہا: ''میں ہوں دولا''۔ شیدا خاموش ہو گئے۔ ایک گھڑی بعد پھر آواز دی۔ پھر شیخ دولا نے جواب دیا۔ تیسری دفعہ بھی یہی جواب ملا تو شیخ شیدا نے دیکھا اب ان کا وقت قریب آ گیا ہے اور پرانے دوستوں میں سے کوئی بھی حاضر نہیں تو پھر کہا: ''بیا، جسے دے، تسے مولا'' اور اپنے پاس بلایا۔ اپنا جبّہ، کوزہ اور پیالہ انھیں عطا فرمایا اور دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اسی زمانے میں شیخ دولا جذب کی ایک خاص حالت سے دوچار ہوئے۔ جب اس بات کا علم شیخ شیدا کے متعلقین کو ہوا وہ شیدائیوں کی طرح شیخ دولا پر پل پڑے تاکہ جبّہ اور گودڑی چھین لیں، لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ شیخ دولا وہاں سے چھوٹے گجرات آ گئے اور اس شہر کے ایک علاقے میں اپنا مسکن بنایا۔ تھوڑے ہی دنوں میں ان کے تصرّفات مشہور ہو گئے۔ انھوں نے زمین کھودی، اینٹیں اور پتھر نکالے اور انھیں استعمال میں لائے۔ زمین کا ایک اور حصہ کھودا اور وہاں سے بیلچہ نکالا۔ شہر کے کنارے پر جو شاہراہ ہے اس پر عالی شان پل بنوایا۔ کابل اور کشمیر کے مسافر اسی شاہراہ سے ہو کر ہندوستان آتے جاتے ہیں۔ انھوں نے اس شہر میں ایک باغ بھی لگوایا جو بہت تر و تازہ تھا۔ ہر قسم کے جانور جمع کیے...... [نام محذوف] اور مشہور پرندے بھی پنجروں میں پالے۔ وہ ان کی خبر گیری کرتے تھے اور کہتے تھے حیوانات سے انس موجودہ زمانے کے انسانوں سے زیادہ اچھا لگتا ہے۔ فقیروں، مسکینوں اور بے

سروسامان سپاہیوں کا خیال رکھتے تھے۔ جو شخص ان کے پاس آتا مٹھائی یا کھانا پیش کرتا۔ ان سے کرامات کا ظہور ہوتا تھا۔ روز بروز ان کی شہرت زیادہ ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ان کی عمر ۱۱۰ سال تک پہنچ گئی اور وہ ۱۰۸۵ھ میں رحلت کر گئے۔ ان کی قبر لاہور کے قریب گجرات میں اسی مقام پر ہے جہاں وہ رہتے تھے۔

سیّد مجتبیٰ فضلی لاہوری: عین التصوّف (تصنیف بعد از ۱۰۸۶ھ/ ۱۶۷۵ء)

سیّد مجتبیٰ فضلی کم سنی میں اپنے والد سید مصطفیٰ (وفات: ۱۳ شعبان ۱۰۷۹ھ /۶ جنوری ۱۶۶۹ء) بن سیّد عبدالرزاق عرف شاہ چراغ لاہوری کے ساتھ شیخ دولا سے ملے تھے۔ اس کا ذکر انھوں نے اپنی کتاب عین التصوف میں، جو شیخ دولا کی وفات ۱۰۸۶ھ سے کچھ ہی عرصہ بعد تصنیف ہوئی، اس طرح کیا ہے:

''شاہ دولہ گجراتی – علیہ الرحمۃ – معمّر بودند؛ تا صد رسیدہ باشد۔ تسخیر خلایق بسیار داشت۔ چنانچہ وقتی در لاہور تشریف آوردہ بود، چندان مردمان شہر برای استقبال در کشتی [رفتند] وچندان ہجوم نمودند [کہ] چند کشتی در دریا غرق شد۔ خرچ بسیار، بی آنکہ چندان دخل بہ نظر درآید، داشت۔ از فیل وشیر واسب وغیرہ جانوران؛ وفقرا بسیار در خانقاہ ایشان داشتند۔ وہمہ از غیب بی سبب می رسید۔ بہ خدمت والد خود زیارت ایشان میسر آمد۔ دست شفقت بر سر فقیر مالیدہ بودند۔ و شیرینی عنایت کردند۔ وقبلہ گاہی را تنہا بہ حجرہ خود بردہ، چیزی کلمہ کلام فرمودند، معلوم نشد۔ الان در قصبۂ گجرات خُرد مدفون اند۔'' (مجتبیٰ

فضلی، ورق ۱۳۲ الف)

ترجمہ: شاہ دولہ گجراتی علیہ الرحمۃ معمّر تھے؛ عمر سو تک پہنچ چکی ہوگی۔ تسخیر خلایق بہت تھی۔ چنانچہ جب لاہور تشریف لائے تو شہر کے اتنے لوگ کشتی میں استقبال کے لیے آئے اور اس طرح یلغار کی کہ چند کشتیاں دریا میں ڈوب گئیں۔ اُن کا آمدن کا بظاہر کوئی ذریعہ نہ ہونے کے باوجود، اخراجات بہت تھے۔ ہاتھی، شیر اور گھوڑے وغیرہ جانور اور فقرا بہت ان کی خانقاہ میں تھے۔ انھیں غیب سے سب کچھ بلا سبب ملتا تھا۔ مجھے اپنے والد کی معیّت میں ان کی زیارت میسر آئی۔ انھوں نے دست شفقت میرے سر پر پھیرا اور مٹھائی عنایت کی۔ پھر قبلہ والد صاحب کو اکیلے، اپنے حجرے میں لے جا کر کوئی بات فرمائی جو [مجھے] معلوم نہ ہو سکی۔ اب وہ چھوٹے گجرات میں مدفون ہیں۔

عبداللہ خویشگی قصوری: معارج الولایت (تصنیف ۱۰۹۶ھ/ ۱۶۸۵ء)

عبداللہ خویشگی قصوری (۱۰۴۳-۱۱۰۶ھ) نے گجرات میں شیخ دولا سے ملاقات کی تھی اس کا ذکر انھوں نے معارج الولایت (تاریخ تصنیف: ۱۰۹۶ھ / ۱۶۸۵ء) میں کیا ہے:

"چون بہ وقت رفتن بہ جانب حسن ابدال بخدمت او رسیدہ شدہ، در مراقبہ بود و قوّالان مدح خواجگان [چشتیہ] -قدس اللہ ارواحہم- می گفتند و چون سر از مراقبہ برآورد، بگریست۔ پس از ساعتی کہ بہ افاقہ آمد، شیرینی بہ این ضعیف می داد۔ بہ عرض رسانیدہ کہ عنایت ظاہری را

خواہان نیست، ہر چہ عنایت شود از نعماء باطنی شود۔ تبسم فرمود و گفت :''این را ہم بگیرید و آن را ہم بگیرید کہ ہر دو شمارا حاصل شود''۔ (عبداللہ خویشگی قصوری، ورق ۱۳۱ ب)

ترجمہ: جب حسن ابدال جاتے ہوئے [گجرات میں] اُن [شیخ دولا] کی خدمت میں پہنچا تو شیخ مراقبے میں تھے اور قوال، خواجگان [چشتیہ] -قدس اللہ ارواحہم- کے مناقب گا رہے تھے۔ جب شیخ نے سر مراقبے سے اٹھایا تو روئے۔ کچھ دیر بعد افاقہ ہوا تو مجھ ضعیف کو مٹھائی دی۔ میں نے عرض کیا کہ ظاہری عنایت کا خواہاں نہیں ہوں، جو کچھ عنایت کرنا ہے باطنی نعمتوں سے عطا کیجیے۔ شیخ مسکرائے اور فرمایا : یہ بھی لے لو اور وہ بھی لے لو تا کہ دونوں چیزیں حاصل ہو جائیں۔

خویشگی نے شیخ دولا کے حالات چشتیہ مشائخ کے ضمن میں درج کیے ہیں۔

حکیم میتا چنابی: تحفۃ البنجاب (تصنیف: ۱۱۰۰ھ/۱۶۸۹ء)

حکیم میتا متخلص بہ چنابی بن حکیم درویش، ساکن کیلاس کے، ضلع گوجرانوالہ نے ۱۱۰۰ھ/۱۶۸۹ء میں مثنوی تحفۃ البنجاب تصنیف کی۔ اس میں پنجاب کے کئی رجال، عمارتوں اور جگہوں کی تعریفیں ہیں۔ حضرت شیخ دولا کے بنوائے ہوئے پلوں کی تعریف یوں کی ہے:

زہے دولا کہ پل ہا را بنا کرد
چہ زرہا صرف در راہ خدا کرد

ز همت پل به هر جایی که بست است
زمُردن، غوطه خوردن خلق رَست است
از آنجا هر که گذرد خرّم و شاد
اگر شاه است یکبارش کند یاد
بباید بر پل از بهرش ثنا گفت
به راهرو نیز "دشمن زیر پا" گفت
کنون بر وی مسافر خشک پوید
نگردد پاش تر، گر خود نشوید
کس از بهر وضو یا ششت و شوی
نیابد آب را بی جست و جوی
نه از غرقش قیامت رخت کس را
نه از مردن ملامت بخت کس را
نه از غوطه کس اکنون دست مالان
برهنه سر، بی دستار نالان
نه کس داند ازین سُو تا بدان سُو
که بر آب است یا در کوچه و کو
وگرنه پیش ازین آنجا خطر بود
مسافر را سقر از وی سفر بود

مدد یاری پی یاری نمی کرد
کس ار سر برد دستاری نمی برد
بگل آلودی بہ نمطی ریش و سر را
کہ نشناسد پسر ہرگز پسر را
برای خواجہ از خجلت غلامی
نمی دیدی و می کردی سلامی

(چنابی، ص ۱۱۶-۱۱۷)

میرزا احمد بیگ لاہوری، احوال و مقامات نوشہ گنج بخش (تصنیف: ۱۱۰۷ھ / ۹۶-۱۶۹۵ء)

میرزا احمد بیگ لاہوری، سلسلۂ نوشاہیہ سے وابستہ تھے۔ انھوں نے ۱۱۰۷ھ / ۹۶-۱۶۹۵ء میں سلسلہ کے بانی حضرت حاجی محمد نوشہ گنج بخش قادری (متوفی ۱۰۶۴ھ/ ۱۶۵۴ء)، ان کی اولاد اور خلفا پر جو رسالہ لکھا اس میں شیخ دولا گجراتی کا ذکر دو بار ہوا ہے۔ ایک بار پنجاب میں حضرت نوشہ گنج بخش کے معاصر بزرگوں کے نام گنواتے ہوئے ''شاہ دولا و حسین گا ینتھ در گجرات'' لکھا ہے (احمد بیگ لاہوری، ص ۱۱۵) اور دوسری بار حضرت نوشہ گنج بخش کے چھوٹے بیٹے حضرت محمد ہاشم دریادل (م: ۱۰۹۲ھ/ ۱۶۸۱ئ) کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ چک سادہ ضلع گجرات میں درخت کے نیچے لیٹے ہوئے تھے۔ دو خدمت گار بھی ساتھ تھے۔ اسی اثنا میں ایک گدڑی پوش فقیر آیا اور اسی درخت کے نیچے آ کر بیٹھ گیا اور ایک لمبی آہ بھر کر کہنے لگا: اے قسمت کہاں لے آئی ہو اور کہاں لے جاؤ گی؟ فقیر سے پوچھا کہ کہاں سے

آئے ہو اور کہاں جانے کا ارادہ ہے۔ اس نے کہا کہ میرا وطن اکبر آباد ہے، وہاں مجھے ایک فقیر نے خواب میں اپنا دیدار کروایا اور اپنی محبت میرے دل میں ڈالی اور دریائے چناب کی طرف اشارہ کیا اور اپنا اور اپنے والد کا نام بتایا لیکن اب میں وہ نام بھول گیا ہوں اور سرگرداں پھر رہا ہوں۔ حضرت ہاشم دریا دل نے اپنے خدمت کار سے کہا: ''شاہ دولا اور دریائے چناب کے کنارے بسنے والے دوسرے بزرگوں کے نام لو۔'' [شاید اس طرح اسے بھولا ہوا نام یاد آ جائے۔]

(احمد بیگ لاہوری، ص ۶۳)

محمود: ملفوظات نقشبندیہ (تصنیف بعد از: ۱۱۲۶ھ / ۱۷۱۴ء)

ملفوظات نقشبندیہ بابا شاہ مسافر نقشبندی اورنگ آبادی (م: (م: ۵ رجب ۱۱۲۶ھ / ۱۷ جولائی ۱۷۱۴ء) کا تذکرہ ہے جو ان کے ایک مرید محمود نے لکھا۔ بابا شاہ مسافر جب دوسری بار حرمین شریفین کی زیارت کو گئے تو راستے میں چھوٹے گجرات میں شاہ دولا سے ملاقات کی۔ ''در اثنای راہ، در گجرات خورد، با معارف آگاہ شاہ دولا ملاقی شدہ بہ احمد آباد گجرات رسیدند۔'' (ص ۶۱)

حافظ محمد حیات نوشاہی: تذکرۂ نوشاہیہ (تصنیف: ۱۱۴۶ھ / ۳۴-۱۷۳۳ء)

حافظ محمد حیات نوشاہی، حضرت نوشہ گنج بخش کے پڑپوتے تھے اور ۱۱۷۳ھ / ۱۷۶۰ء میں تذکرۂ نوشاہیہ لکھا۔ اس میں چار بار شیخ دولا کا نام آیا ہے۔ دو واقعات تو وہی ہیں جو میرزا احمد بیگ لاہوری نے لکھے ہیں (محمد حیات نوشاہی، ص ۶۱: ۱۱۲) دو مزید واقعات یہ ہیں:

''حضرت در استراحت بودند و یکی از یاران پای مبارک می مالید۔ در

دل او خطرہ ای گذشت کہ مراتب میاں دَولا چیست؟ حضرت از خطرۂ او واقف شدہ، فرمودند کہ مراتب او این است۔" (محمد حیات نوشاہی، ص ۹۴)

ترجمہ: ایک دفعہ حضرت [نوشہ لیٹے ہوئے] آرام فرما رہے تھے اور ایک مرید پاؤں مبارک دبا رہا تھا۔ اس مرید کے دل میں یہ خیال گذرا کہ میاں دَولا کے مراتب کیا ہیں؟ حضرت نوشہ نے اس کے خیال سے آگاہ ہوئے فرمایا کہ ان کے مراتب یہ ہیں۔

اس واقعہ سے یہ پتا چلتا ہے کہ شیخ دولا صاحبِ مراتب تھے اور حضرت نوشہ ان کے مراتب سے آگاہ تھے۔

دوسرا واقعہ شاہ جہان بادشاہ (۱۰۳۷-۱۰۶۸ھ/ ۱۶۲۸-۱۶۵۷ء) کی کشتی گرداب میں پھنسنے اور اسے چھڑانے کا ہے۔ چار کامل ولی بادشاہ کی مدد کو پہنچے۔ ایک حضرت نوشہ گنج بخش اور دوسرے میاں شاہ دولا تھے: "در آن زمان چہار کس از اولیای کمل رسیدند۔ یکی حضرت شاہ و یکی میاں شاہ دولا۔۔" (محمد حیات نوشاہی، ص ۹۸)

محمد اسلم پسروری: فرحت الناظرین (تصنیف: ۱۱۸۴ھ/ ۱۷۷۰-۱۷۷۱ء)

محمد اسلم بن محمد حفیظ انصاری پسروری نے فرحت الناظرین (تاریخ تصنیف: ۱۱۸۴ھ/ ۱۷۷۰-۱۷۷۱ء) میں مرآۃ العالم ہی کی عبارت کو دہرایا ہے اور صرف شیخ دولا کی تاریخ وفات کا اضافہ کیا ہے کہ ۳۲ سال جلوس عالمگیری میں واقع ہوئی۔ (محمد اسلم پسروری، ص ۸۷) جس کے مطابق ۱۰۹۹ھ/ ۸۸-۱۶۸۷ء ہوتا ہے۔

پسروری نے فرحت الناظرین میں ''ذکر بلاد'' کے تحت ''گجراتِ شاہ دولہ'' کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے: ''قبر شاہ دولہ در آنجا، لہذا بہ گجراتِ شاہ دولہ مشہور۔'' (محمد اسلم پسروری، ص ۲۱۹) شاہ دولہ کی قبر وہاں ہے اس لیے گجرات شاہ دولہ کے نام سے مشہور ہے۔

شیخ دولا سے منسوب ایک تصنیف کی اصلیت:

شریف کنجاہی مرحوم کی کتاب حضرت شاہ دولا دریائی گجراتی: حیات و تعلیمات موجود ہے۔ اس میں کنجاہی صاحب نے ایک ایسی بات نکالی ہے جو محض قیاس پر مبنی ہے اور اُسے اپنی کتاب کا پورا باب بنا دیا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ شریف کنجاہی صاحب کو دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور میں ایک قلمی کتاب سیر السلوک [کذا: سیر و السلوک] الی ملک الملوک ملی، جس پر الحاقی قلم سے لکھا ہے کہ یہ شاہ قاسم المشہور بہ شاہ دولا بحری کی تصنیف ہے۔ اب آگے کنجاہی صاحب کی زبانی سنیے:

> ''مؤلف [یعنی خود کنجاہی صاحب] کے خیال میں چوں کہ معروف ناموں میں سے کوئی بھی آپ [یعنی شیخ دولا] کا ذاتی نام نہیں ہے کہ ان سب کی توصیفی توجیہ ممکن ہے، اس لیے کسی مزید نقاب کشائی تک سیر السلوک [کذا] کو آپ کی تصنیف کے طور پر قبول کر لینا چاہیے۔ یہ ممکن ہے کہ یہ تصنیف ملفوظاتی قسم کی ہو اور ان کی اپنی تحریر نہ ہو لیکن اور بہت سے اکابر کے ملفوظات کی طرح اسے بھی شاہ دولا صاحب کے ارشادات مان لینے میں اس وقت تک کوئی ہرج نہیں جب تک کوئی

واضح دلیل اس کے خلاف رائے قائم کرنے پر مجبور نہ کر دے۔"
(شریف کنجاہی، ص ۸۲)

نسخۂ لاہور کا مقام کتابت بغداد ہے۔ کنجاہی صاحب نے اپنے مؤقف۔سیر و السلوک شیخ دولا گجراتی کی تصنیف ہے۔کو مضبوط کرنے کے لیے یہ قیاس ظاہر کر دیا کہ بغداد سے مراد بغدادِ عراق نہیں بلکہ بغدادِ پنجاب ہے جو شور کوٹ کے قریب واقع ہے! (شریف کنجاہی، ص ۸۳) حالانکہ نسخۂ لاہور کے کاتب نے مقام کتابت کا پورا نام "باغ علی القادری بغداد" لکھا ہے لیکن کنجاہی صاحب نے اس کا کتمان کیا ہے تاکہ قاری کا ذہن پنجاب ہی میں بھٹکتا رہے، ورنہ شور کوٹ والے بغداد میں باغ علی القادری کا تاریخی وجود بھی ثابت کرنا پڑتا۔ اگر کنجاہی صاحب نے کتاب سیر والسلوک کا تذکرہ رواروی میں کیا ہوتا تو کوئی خاص بات نہ تھی، لیکن طرفہ تماشہ یہ ہوا کہ انھوں نے اسے شیخ دولا گجراتی کی تصنیف تسلیم کر کے پہلے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "ممکن ہے کہ آپ کا نام قاسم ہو" (ایضاً، ص ۲)، پھر اس تصنیف کی بنیاد پر شیخ دولا کے نظریاتِ تصوّف اور مکتبِ فکر کی عمارت کھڑی کی اور معاصر مکاتب تصوف سے تقابل کیا اور آخر میں سیر والسلوک کے مضامین کا ایک اردو خلاصہ بھی پیش کر دیا۔

کنجاہی صاحب کی کتاب میں سیر والسلوک پر تبصرہ کے لیے صفحات ۸۲ تا ۱۰۰ مختص ہیں۔ انیس صفحات کی اس بحث میں کنجاہی صاحب کی ایک معاملے میں خاموشی معنی خیز ہے۔ انھوں نے یہ کہیں نہیں بتایا کہ کتاب سیر والسلوک کس زبان میں لکھی گئی ہے۔ اگر وہ لکھ دیتے کہ یہ کتاب عربی زبان میں ہے تو شاید ان کے لیے شیخ دولا کی عربی دانی ثابت کرنا ممکن نہ ہوتا کیوں کہ شیخ دولا کی باقاعدہ تحصیل علم کا تذکرہ

کہیں نہیں ملتا۔

اب ہمیں اس بحث کو سمیٹ لینا چاہیے اور سیر والسلوک کی بقول کنجاہی صاحب ''نقاب کشائی'' کرنا چاہیے۔ یہ کتاب، درحقیقت شیخ قاسم بن صلاح الدین الخانی الحلبی (۱۰۲۸-۱۱۰۹ھ/۱۶۱۹-۱۶۹۷ئ) کی عربی تصنیف ہے۔ شیخ قاسم حلب کے رہنے والے تھے، لیکن عراق، حجاز اور ترکی کا سفر بھی کیا۔ آخر حلب واپس چلے گئے اور اپنی وفات تک وہاں فتوی دیتے رہے۔ ان کے حالات زندگی اور دیگر عربی تصانیف کا تذکرہ ہمیں زیادہ تر عربی مآخذ میں ملتا ہے جیسے اسماعیل پاشا بغدادی کی تصانیف ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون (ج ۲، ص ۳۴) اور ھدیۃ العارفین اسماء المؤلفین وآثار المصنفین (باب القاف، ص ۸۳۳) اور عمر رضا کحالہ کی معجم المؤلفین (حرفِ قاف)، ان تمام مآخذ میں سیر والسلوک کو قاسم حلبی کی تصنیف بتایا گیا ہے۔ اتفاق سے اس کتاب کا ایک مخطوطہ راقم السطور کے ذخیرۂ کتب میں بھی موجود ہے۔ اس کے مندرجات وہی ہیں جو کنجاہی صاحب نے بتائے ہیں۔ میرے نسخے میں واضح طور پر اسے الشیخ قاسم الخانی کی تصنیف قرار دیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۳۱۵ھ میں مراکش کے شہر فاس سے شیخ قاسم حلبی کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

یہاں یہ انکشاف بھی دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ شریف کنجاہی پہلے شخص نہیں ہیں جنھیں سیر والسلوک کے اصل مصنّف کے تعین میں مغالطہ ہوا ہے بلکہ ان سے پہلے، ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء میں جب امیر محمد تاجر کتب پشاور نے اسے مطبع انصاری، دہلی سے طبع کر کے شائع کیا تو اسے شیخ قاسم افغان حنفی مکّی کی تصنیف قرار دیا۔ ناشر/طابع کا اشارہ یقیناً شیخ قاسم افغان سلیمانی قادری پشاوری

(۹۵۲-۱۰۱۶ھ/ ۱۵۴۵-۱۶۰۷ء) کی طرف ہے جنھوں نے عرب کا سفر بھی کیا لیکن ان کا انتقال ہندوستان کے قلعۂ چنار میں ہوا۔ (غلام قدوس، ص ۱۸۱-۲۱۳)

سیر والسلوک کے نسخہ لاہور کو "شاہ قاسم المشہور بہ شاہ دَولا بحری" کی تصنیف قرار دیے جانے کا معاملہ بھی دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری کے فہرست نویسوں نے صاف کر دیا ہے۔ انھوں نے اسے قاسم بن صلاح الدین الخانی حلبی ہی کی تصنیف قرار دیا ہے۔ ہاں یہ جملہ ضرور لکھا ہے:

"آپ نے تقریباً دس برس تک مختلف ممالک میں بادیہ پیمائی کی، یہی وجہ ہے کہ آپ کو شاہ دولا برّی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔" (محمد متین ہاشمی و حافظ غلام حسین، ج ۵، ص ۱۰۳)

اب معلوم نہیں اس جملے کا استناد نسخۂ دیال سنگھ کی الحاقی تحریر ہے یا فہرست نویسوں کے سامنے جو عربی مآخذ تھے ان سے یہ جملہ لیا گیا ہے۔ کم از کم مجھے کثرت سیاحی کے اظہار کے لیے "شاہ دولا بحری" کا لقب عجیب سا لگتا ہے کیونکہ اس شہرت سے کسی طرح بھی سیاحی کا مفہوم نہیں نکلتا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ یہاں "برّی" ہے اور کنجاہی صاحب نے اسے "بحری" اور بحری سے "دریائی" بنا کر "شاہ دولا دریائی گجراتی" پر چسپاں کر دیا ہے!

شیخ دولا گجراتی پر مستقل راست فارسی مآخذ:

شیخ دَولا کے حالات اور کرامات پر ہمیں گجرات کے دو قدیم مصنّفین کی کتابیں ملتی ہیں۔ ایک محمد چراغ بن شاہ مراد قادری کا زیرِ نظر "تذکرۂ شیخ دَولا" اور دوسرا لالہ مشتاق رام کا "کرامت نامۂ شاہ دَولا"۔ قرائن سے یہ بات ثابت ہے کہ چراغ

قادری کا تذکرہ پہلے لکھا گیا اور مشتاق رام کی کتاب ۱۱۳۲ھ/ ۱۷۲۰ء میں تصنیف ہوئی۔(منزوی، ج ۱۰، ص ۹۴۶)

تذکرۂ شیخ دولا از محمد چراغ قادری پر ایک نظر:

ڈاکٹر گوہر نوشاہی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں، جو اسی اشاعت میں شامل ہے، اس تذکرے کی اہمیت اور افادیت پر خوب روشنی ڈالی ہے اور مصنّف کے حالات کی بھی جست و جو کی ہے۔ میں بھی چند نکات کی طرف توجہ دلاتا ہوں:

صاحبِ تذکرہ کے نام کا املاء:

صاحبِ تذکرہ کا نام ماضی اور حال میں دو طرح سے ''دولہ'' اور ''دولا'' لکھا جاتا رہا ہے۔ محمد چراغ نے اپنے تذکرے میں ہر جگہ ''مَولا'' کے وزن پر ''دَولا'' لکھا ہے اور ان کے لیے ''مقرب مولا شیخ دولا'' اور ''مقرب حضرت مولا شیخ دولا'' کی ترکیبیں استعمال کی ہیں۔ اسی طرح ان کی تاریخ وفات ''محبوبِ مولا شیخ دولا'' سے نکالی ہے۔ مصنّف کے تتبع میں ہم نے بھی ''دولا'' املاء اختیار کیا ہے۔

محمد چراغ نے انھیں ہر جگہ ''شیخ دولا'' یا ادب سے صرف ''شیخ'' لکھا ہے اور کہیں ''شاہ دولا'' نہیں لکھا۔ جیسا کہ اب شہرت عام ہوگئی ہے۔ شیخ دولا لودھی افغان تھے۔ ہمارے ہاں عام طور پر ''شاہ'' کا سابقہ سیّد النسب افراد کے لیے استعمال ہوتا ہے، اگرچہ برائے ادب واحترام غیر سیّدوں کے لیے بھی دیکھنے میں آیا ہے۔ میں نے مصنّف کے تتبع میں انھیں ''شیخ دولا'' ہی لکھا ہے۔ متاخر تذکروں میں شیخ دولا کا نام یا لقب ''کبیر الدین'' ملتا ہے، وہ اس تذکرے میں نہیں ہے۔

شیخ دولا کے بارے میں بنیادی معلومات:

☆ مصنّف نے شیخ دولا کے آبا و اجداد کے بارے میں ضروری معلومات مہیا کی ہیں یعنی ان کے والد، والدہ اور مورث اعلیٰ کا نام اور قوم اور قبیلے کا نام درج کیا ہے۔ یہاں تک کہ شیخ کا حلیہ بھی لکھا ہے۔

☆ مصنّف نے شیخ دَولا کی اولاد کے بارے میں از خود کوئی تحقیق نہیں کی اور بھاون نامی شخص کے بارے میں صرف یہ لکھا ہے ''بعض اس کو حقیقی بیٹا کہتے ہیں اور بعض لے پالک'' مصنّف جو شیخ دولا کا معاصر ہے، اس کے لیے اس امر کی تحقیق کرنا دشوار نہ تھا کہ بھاون کا شیخ دولا سے کیا رشتہ ہے؟ البتہ مصنّف نے شیخ کے مرض الموت کے وقت شیخ اور بھاون کے درمیان ہونے والا جو مکالمہ نقل کیا ہے اس سے بھاون کا متبنیٰ ہونا قرین قیاس ہے۔ شیخ دَولا کے طرز تخاطب سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ دَولا اس سے راضی نہ تھے۔

☆ شیخ دَولا بہ قول مصنّف، مجذوب اطوار تھے۔ مجاذیب میں جمالیاتی حس کا پایا جانا نادر ہے، لیکن شیخ دَولا باوجود مجذوب اطوار ہونے کے جمالیاتی ذوق رکھتے تھے۔ اور فطرت کے حسن سے لطف اندوز ہوتے تھے۔۔ اس تذکرے میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ عبدالعزیز بن فتح محمد نامی شخص کوئی ایک ماہ تک شیخ دَولا کی خدمت میں رہ کر اپنے والد کا انتظار کرتا رہا، جس نے دہلی سے گجرات پہنچنا تھا۔ انتظار کی کوفت نے اسے بے چارہ اور مایوس کر دیا۔ اس نے تنگ آ کر شیخ سے رخصت طلب کی تو شیخ نے اس کی جھولی میں شکر اور مٹھائی ڈال کر کہا کہ شہر سے مشرق کی طرف جو شاہراہ ہے وہاں خوب سبزہ زار ہے۔ کنوؤں پر گھومنے والے رہٹ لگے ہیں، جن کی آواز روح کو

لبھاتی ہے، سیر اور تماشے کے لیے شہر کے اس طرف نکل جاؤ۔

مصنّف کا نام:

تذکرے کے دیباچے میں مصنّف نے اپنا نام ''فقیر چراغ بن شاہ مراد قادری'' لکھا ہے۔لیکن جامع الفنون، جس کا ذکر آئے گا، کے دیباچے میں پورا نام ''محمد چراغ بن شاہ مراد گیلانی'' تحریر کیا ہے۔میں نے اسی مکمل نام کو ترجیح دی ہے۔

مصنّف کا اسلوب:

یہ کتاب سادہ اور آسان فارسی میں لکھی گئی ہے اور اس پر پنجابی/ ہندی زبان کے اثرات بے حد نمایاں ہیں۔خود مصنّف کا بیان ہے کہ اس نے بناوٹ کے بغیر فطری اسلوب اختیار کیا ہے اور بلاغت اختراع کیے بغیر، مبالغے سے پاک فارسی اپنائی ہے تاکہ فہم وادراک سے قریب تر اور جھوٹ سے دور رہا جا سکے۔''سبب سادگی عبارت و آسانی مضمون در این رسالہ آن است......فارسی بی تصنّع طبعی [طبیعی] وکلام بی اختراع بلاغت و مبالغہ سخن بر صفحۂ کاغذ رتختم تا بہ فہم نزدیک و از کذب دور تواند شد۔'' (محمد چراغ، ''باعث تصنیف'')

چراغ قادری کی فارسی نثر کا ایک اچھا نمونہ اس اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے:

''مردم را از پیش بر کران کردہ، نزد آنہا تشریف می آوردند و خیر باد و احوال پرسی و تبرک بخشی کردہ، رخصت نمودہ بہ جای خود آمدہ می نشستند۔''

عالمگیری عہد میں پنجاب میں سادہ نویسی کا یہی اسلوب تذکروں کے لیے

موزوں سمجھا جاتا تھا جیسا کہ مرزا احمد بیگ لاہوری نے احوال و مقامات نوشہ گنج بخش (مؤلفہ ۱۱۰۷ھ) میں لکھا ہے: ''این مسودہ را بہ عبارت سہل و سادہ در قید کتابت آوردم۔'' (احمد بیگ لاہوری، ص) ۲

پورے تذکرے میں مصنّف کا شعری ذوق نمایاں ہے۔ انھوں نے موقع کی مناسبت سے جا بجا ابو سعید ابوالخیر، مولانا روم، سعدی، حافظ اور دیگر صوفی مشرب شعرا کا کلام بطور حوالہ درج کیا ہے۔ بعض مقامات پر احادیث اور عربی اقوال بھی بطور شاہد استعمال ہوئے ہیں۔

مصنّف کی غیر جانب داری:

چراغ قادری کی شخصیت غیر جانبدار ہے۔ وہ خود سلسلۂ قادریہ سے وابستہ ہیں اور شیخ دَولا کے محض ہم وطن اور ارادت مند ہیں، اس لیے انھوں نے شیخ دَولا کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ یقیناً مبالغے اور اغراق سے پاک ہوگا۔

تاریخوں کا اہتمام:

کسی بھی تذکرے کی بنیادی خصوصیت اس میں مندرج واقعات کو تاریخوں کے ساتھ قلم بند کرنا ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت اس تذکرے میں اگرچہ بدرجۂ اتم موجود نہیں ہے (یہاں تک کہ مصنّف نے اپنی کتاب کا سنۂ تصنیف بھی نہیں لکھا ہے) لیکن مصنّف نے تذکرے کی مرکزی شخصیت شیخ دَولا کی تاریخ ولادت (۲۵ جلوس اکبر بادشاہ مطابق ۹۸۷ھ) اور تاریخ وفات (۱۵ ربیع الاول ۱۰۸۶ھ) ضرور لکھی ہے۔ جہاں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کا ذکر آیا ہے وہاں ان کی تاریخ وفات بھی درج کی ہے۔

صوفی اور مُلّا کی باہمی آویزش:

صوفی اور ملّا کی باہمی آویزش کی روایت بہت پرانی ہے۔ ملّا کی قوت دافعہ اور صوفی کی قوت جاذبہ کی ایک عمدہ مثال ملّا سید عبدالباقی اور صوفی دَولا کا باہمی روّیہ ہے جو اس تذکرے میں تفصیل کے ساتھ درج ہوا ہے۔

دو معاصر علماء کے حالات:

محمد چراغ نے شیخ دولا کی نسبت سے ان کے دو معاصر علماء مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی (وفات: ۱۰۶۶ھ/ ۱۶۵۶ء یا ۱۰۶۷ھ/ ۱۶۵۷ء) اور سید محمد فاضل گجراتی کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس تذکرے سے معلوم ہوا کہ شاہجہان کے بیٹوں کے درمیان جب تخت نشینی کی جنگ جاری تھی اور سیالکوٹ کے حالات پرامن نہ تھے، مولانا اپنے اہل وعیال کو لے کر کچھ دنوں کے لیے سیالکوٹ سے متصل سوہدرہ میں اقامت گزین ہو گئے تھے۔ علامہ سیالکوٹی کی وفات کے تذکرے میں مصنّف نے دو مادّہ ہائے تاریخ درج کیے ہیں۔ پہلا مادّہ کسی رند سے منسوب کیا ہے: ''میاں دن تن سُتا'' جس سے ۱۰۶۶ برآمد ہوتا ہے۔ دوسرا مادّہ اپنے استاد مولانا عبدالرحمان جامی کا بتایا ہے جو ایک قطعے میں استعمال ہوا ہے:

حسرت تاریخ و آنگہ بہر تاریخ دگر
''گہ بمدرسہ آیم و گاہ می روم در خانقاہ''

میں نے اپنے قیاس سے واوین میں درج مصراع کو مادّہ قرار دیا ہے، لیکن اس میں چند اشکالات ہیں۔ اولاً اس مادّہ سے ۱۶۷۶ برآمد ہوتا ہے۔ اسے اگر عیسوی سال وفات سمجھا جائے تو یہ مصنّف کے درج کردہ علامہ سیالکوٹی کے قمری سال وفات

۱۰۶۶ھ سے مطابقت نہیں رکھتا۔ثانیاً گیارہویں صدی ہجری میں ہمارے ہاں ابھی عیسوی تاریخوں کے مطابق مادّے لکھنے کا رواج نہیں ہوا تھا۔ثالثاً تذکرے کے نسخۂ گنج بخش (2678) میں یہ مصراع یوں کتابت ہوا ہے:

''گہ بمدرسہ آیم وگاہ می روم در خانقا''

یعنی''خانقاہ'' کی ہاء گرادی ہے۔اس سے ۱۶۷۱ برآمد ہوتے ہیں۔ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے مرتّبہ متن میں یہ مصراع اس طرح کمپوز ہوا ہے:

''گہ بمدرسہ آیم وگہ می روم در خانقاہ''

انھوں نے اس میں پوشیدہ تاریخ سے قطعاً تعرض نہیں کیا! بہرحال یہ معما مجھ سے حل نہیں ہوا۔

مصنّف نے سیّد محمد فاضل گجراتی کا علمی مرتبہ بھی ان کے شایانِ شان الفاظ میں بیان کیا ہے۔یہ ایک مقامی عالم دین کے بارے میں بہت مفید معلومات ہیں جن سے علما کے تذکرے لکھنے والوں کو استفادہ کرنا چاہیے۔

ہمارے ہاں برّصغیر کے صوفیہ کے ملفوظات پر جو فارسی کتابیں ملتی ہیں انھیں دیکھ کر یہ خیال گذرتا ہے کہ شاید صاحبِ ملفوظات بزرگوں کی روزمرّہ گفتگو کی زبان بھی فارسی تھی۔لیکن ایسا نہیں ہے اور یہ محض اشتباہ ہے۔ہر صاحبِ ملفوظ بزرگ اپنی مادری اور علاقائی زبان میں گفتگو کرتا تھا اور جامع ملفوظات اسے فارسی میں بدل دیتا تھا، جو اس وقت برّصغیر میں تصنیف وتالیف کی زبان اور فضل ودانش کا نشان تھی۔اس بات پر کافی شواہد موجود ہیں کہ ہمارے مقامی بزرگوں کی زبان بھی مقامی تھی۔ان کے فارسی تذکروں اور ملفوظات کے مجموعوں میں کئی برجستہ جملات مادری/علاقائی

زبانوں میں ملتے ہیں۔ زیرِ نظر تذکرے میں تو واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ شیخ دَولا سادہ پنجابی زبان بولتے تھے۔

اگر ہم عالمگیری عہد میں پنجاب میں لکھے گئے تذکروں کا تقابلی جائزہ لیں تو ان میں نہ صرف اسلوب کی مماثلتیں ملتی ہیں بلکہ بعض عصری واقعات اور رجحانات کی یکسانی کے شواہد بھی مل جاتے ہیں۔ میں دو ایک مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

الف: مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کا علومِ معقول و منقول میں تبحر سب پر واضح ہے۔ لیکن وہ معاصر بزرگان دین کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے تھے اور ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ حضرت نوشہ گنج بخش اور ان کے مرید خاص سیّد صالح محمد، ساکن چک سادہ، ضلع گجرات کی خدمت میں مولانا سیالکوٹی کا جانا اور بہرہ یاب ہونا احمد بیگ لاہوری کے تذکرے سے معلوم ہے۔ (احمد بیگ لاہوری، ص ۷۵، ۱۲۸) جب کہ چراغ قادری کے زیرِ نظر تذکرے سے، پتا چلتا ہے کہ مولانا سیالکوٹی شیخ دَولا کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تھے۔ علماء کا صوفیہ کی مجالس میں جانا ایک رجحان تھا۔

ب: شاہجہانی دور میں گجرات کا حاکم، مرزا بدیع الزمان تھا۔ رعایا اس کی سختی اور ظلم سے تنگ تھی۔ اس کے مظالم اور بعد میں قتل ہو جانے کا ذکر احمد بیگ لاہوری (ص ۵۳، ۵۴) اور چراغ قادری کے ہاں ملتا ہے۔ احمد بیگ نے بدیع الزمان کا مارا جانا اپنے ممدوح شیخ، اور چراغ قادری نے اپنے ممدوح شیخ کی کرامات میں شمار کیا ہے۔ جو بھی ہو، ایک واقعہ ہوا جس کی تصدیق دو ہم عصر تذکروں سے ہو جاتی ہے۔

ج: چراغ قادری نے اپنے ممدوح، شیخ دولا کی عمارت سازی سے غیر معمولی دل چسپی کا ذکر کیا ہے اور ان کی بنائی ہوئی عمارتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ خاص

طور دریاے دیوگہ پر پل بنانے کا واقعہ لکھا ہے۔شیوخ طریقت یا شیخ زادوں میں عمارت سازی کا شوق اور رجحان قابل غور ہے۔شاہجہان بادشاہ نے ایک دفعہ کابل کی مہم کے وقت دریاے چناب عبور کرنے کے لیے اس پر پل بنانے کا حکم دیا تھا۔حضرت نوشہ گنج بخش کو یہ خبر ملی تو فرمایا اگر شاہجہان میرے بیٹے میاں برخوردار کو یہ پل بنانے کا حکم دیتا تو وہ ایک روز میں تیار کر دیتا، اس لیے کہ وہ بابرکت تھے اور مشکل کاموں میں دسترس رکھتے تھے (احمد بیگ لاہوری، ص ۶۰)۔چراغ قادری کی روایت کے مطابق شاہجہان کی بیٹی بادشاہ بیگم نے گجرات کے قریب دریاے دیوگہ پر پل بنانا چاہا۔گجرات کے حاکم بدیع الزمان کو طلب کر کے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔بدیع الزمان نے جواب دیا کہ دیوگہ بہت سرکش دریا ہے، اس پر پل کا استحکام ممکن نہیں ہے، البتہ اس کام کے لائق شیخ دَولا ہیں، اگر وہ توجہ فرمائیں تو لازوال پل بنا سکتے ہیں۔

محمد چراغ کے بارے میں مزید معلومات:

جامع الفنون کی تدوین:

ذخیرۂ شیرانی، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور، شمارہ 5725/2406 کے تحت ایک قلمی کتاب جامع الفنون موجود ہے۔جس کا تعارف ڈاکٹر ظہور الدین احمد نے اپنی کتاب پاکستان میں فارسی ادب، (ادارۂ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب لاہور، ۱۹۷۷ء) جلد ۳، ص ۸۷۴ میں درج کیا ہے۔مجھے بھی یہ مخطوطہ دیکھنے کا موقع ملا ہے اور میں نے اپنی کتاب سیہ بر سفید، (مرکز پژوہشی میراث مکتوب، تہران ۲۰۱۱ء) میں ص ۱۲۵-۱۲۶ پر اس کا مختصر تعارف لکھا ہے۔یہ محمد رشید گجراتی بن شیخ

عبدالرحمان جامی کی تصنیف ہے جسے محمد چراغ بن شاہ مراد گیلانی نے ۱۰۷۷ھ/ ۶۷-۱۶۶۶ء میں جمع اور مرتّب کیا اور خود ہی اس کی تاریخ ترتیب لکھی:

نوشتم من این نامۂ پُر فگار
بتاریخ ہفتاد و ہفت و ہزار
بجانم چو تاریخ سالش دمید
بقای ز انشا محمد رشید
بخندہ درآورد چون غنچہ باغ
چراغم ز تاریخ او "لب دماغ"
۱۰۷۷

محمد رشید انشاء نگار تھے اور جامع الفنون ان کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ اس میں کچھ خطوط تو حقیقی اور اصلی ہیں جو محمد رشید نے اپنے مربّی شمشیر خان ترین کی طرف سے لکھے ہیں اور کچھ خطوط نمونے کے طور پر ہیں تا کہ انشاء نگاروں کے کام آسکیں۔ کتاب کے تیسرے باب (ورق ۶۹ تا ۸۷) میں محمد رشید گجراتی کے چند خطوط معاصر "درویشان عالی مقدار و علمایان نامدار" کے نام درج ہوئے ہیں جو بہت اہم ہیں۔ ان میں ایک خط حضرت شیخ دولا کے نام ہے۔ مرتّب کتاب نے دیباچے میں اپنا پورا نام "محمد چراغ بن شاہ مراد گیلانی" [نسخہ میں کیلانی] لکھا ہے اور مصنّفِ کتاب محمد رشید سے اپنی قرابت اور رابطے کی تین نسبتیں ظاہر کی ہیں:

۱۔ مرتّب نے مصنّف کے والد شیخ عبدالرحمان جامی سے اکتسابِ علم و تحصیلِ ادب کیا تھا۔ اس رشتے کو مرتّب نے بڑی خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔ "اکتساب

فضایل علم و اکتساب شرایف ادب از خدمت قدوۃ الانام مخدوم عظام مربّی لفظی ومعنوی، مولوی گرامی شیخ جامی نوّر مرقدہ، کہ او را پدر واین کمترین را بحکم ''خیر الاباء من علمک'' بہترین پدران است، نمودہ۔''

۲۔ مرتّب اور مصنّف دونوں، تصوّف کے ایک ہی سلسلہ -قادریہ- میں ایک ہی شیخ طریقت سے بیعت تھے۔ ''رہنمونی سعادت ابدی در خرقۂ ارادت و تلقین تربیت سلسلہ علیہ العالیہ حضرت قادریہ بہ آن مخترع نکات شگرف ہم بیعت است و بہ خلعت غلامی یک مرشد مخصوص۔''

۳۔ مرتّب اور مصنّف ایک ہی شہر -گجرات- میں رہتے تھے۔ ''بوی وفا و اخلاص از سر سواد ہموطنی و ہمسایگی قصبہ جنّت مرتبہ، فیض مساوات، ابد المعمورات، شہر گجرات معروف بالشہریت محبوبِ مولا، شیخ دولا، کہ مرکز درویشان صاحب نظر و مجمع فضلای دین پرور و مرجع نکتہ سنجان دانش گستر است۔''

اگر چہ جامع الفنون محمد چراغ کی اپنی تصنیف نہیں ہے اور وہ محض اس کے مرتّب اور دیباچہ نگار ہیں۔ لیکن اسی دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی کے ماہر انشاء نویس تھے۔

چراغ کے تذکرۂ شیخ دولا میں محمد رشید نامی ایک شخص کا واقعہ درج ہوا ہے جسے حاکم اٹک داور دادخان کا معتمد اور معتبر منشی بتایا گیا ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ جامع الفنون کے مصنّف ہوں گے۔

محمد چراغ کے خطوط:

دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، شمارہ 578 کے تحت ایک قلمی بیاض موجود

ہے جس میں بہت سے خطوط اور فرامین نقل ہوئے ہیں۔اس بیاض کے مندرجات کی تفصیل فہرست مخطوطات (عربی، فارسی، پشتو، اردو، پنجابی) مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، مرتبہ سید محمد متین ہاشمی و حافظ غلام حسین، لاہور، بلا تاریخ، ج ۵، ص ۱۹۳۔۱۹۵ میں دیکھی جا سکتی ہے۔اس میں مندرجاتِ ذیل قابل توجہ ہیں:

"مکتوب مسودۂ شاہ چراغ مرحوم ساکن پوٹھوہار، پرگنہ دانگلی، بجانب سید عصمت اللہ ساکن سید جمال پور، پرگنۂ گجرات"، ورق ۴۰

جواب مکتوب مسودۂ سید عصمت اللہ بجانب شاہ چراغ، ورق ۴۴

مکتوبات غلام اسمٰعیل پسر شاہ چراغ، ورق ۴۵

محمد چراغ کا کچھ عرصہ پوٹھوہار میں سکونت پذیر ہونا، ڈاکٹر گوہر نوشاہی صاحب کے مضمون میں مذکور ہے، یقیناً یہ خطوط ہمارے ممدوح محمد چراغ ہی کے ہیں۔

محمد چراغ کے رحمانی نوشاہی ہونے کی نفی:

ڈاکٹر گوہر نوشاہی صاحب نے شاہ چراغ کے ایک پنجابی ستوارے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ شاعر، حضرت عبدالرحمٰن عرف پاک رحمٰن بھڑی والوں کی وساطت سے حضرت نوشہ گنج بخش قادری بانی سلسلۂ نوشاہیہ سے منسلک ہے۔اس پنجابی ستوارے کے متعلقہ مصرعے یہ ہیں:

۱۔جانی دشمن نال نوشہ دے بولن بول اَوَلے نیں

۲۔پاک جمال وکھال جیلانی وقت نسے سب زنگی دا

۳۔شاہ چراغ ہن تائیں جاپے نوشہ اگے منی میں

ان مصرعوں کو سامنے رکھتے ہوئے ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے دوٹوک نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ''پہلے بند میں حضرت نوشہ صاحب اور حضرت پاک صاحب دونوں کا اور دوسرے بند میں حضرت نوشہ گنج بخش کا ذکر واضح طور پر موجود ہے۔'' (گوہر نوشاہی، ص ۴۸)

میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ پہلے مصرعے میں موجود اگر لفظ ''نوشہ'' کو حضرت نوشہ گنج بخش پر قیاس کر لیا جائے تو اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ حضرت نوشہ کے کچھ لوگ جانی دشمن بھی تھے جو ان کے ساتھ سخت کلامی کرتے تھے! لیکن اس سے یہ کیسے ثابت ہو سکتا ہے کہ شاعر حضرت نوشہ سے منسلک ہے؟ دوسرے مصرعے میں موجود لفظ ''پاک'' کو پاک رحمٰن بھڑی والوں پر منطبق کیا گیا ہے۔ یہ قرینہ بھی درست نہیں ہے۔ وہاں ترکیب ''پاک جمال'' آئی ہے یعنی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا دیدار پاک۔ پہلا مصرع واضح ہے کہ شاعر کا اپنی ہی طرف اشارہ ہے اور وہ جانی دشمنوں کی بدکلامی سے نالاں ہے۔ تیسرے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ شاہ چراغ تبھی شاہ چراغ نظر آتا ہے جب نوشہ کے آگے قبول ہو گیا۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت سیّد شرافت نوشاہی (م: ۱۹۸۳ء) کی تصنیف کردہ سلسلۂ نوشاہیہ کی تاریخ شریف التواریخ میں اس شاہ چراغ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

تذکرۂ شیخ دولا کے قلمی نسخے:

اس تذکرے کے تاحال دو قلمی نسخے دریافت ہوئے ہیں:

۱۔ کتب خانہ گنج بخش، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، شمارہ ۲۶۷۸، اس نسخے کا کاتب میاں محسن علی، ساکن کا تیت تاج خان ہے اور یہ لالہ داتا رام کی فرمائش پر تحریر ہوا ہے۔ تاریخ کتابت ۶ کاتک سمت ۱۸۹۲ بکرمی ہے۔ اس

کے مطابق عیسوی تاریخ ۸ نومبر ۱۸۳۷ ہوتی ہے۔ ۸۴ ورق ۔نسخہ خوش خط نہیں ہے۔کاتب نے رکابہ (Word Catcher) کا استعمال کیا ہے جس کی مدد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ کہیں کہیں سے ناقص ہے۔چونکہ اس نسخے میں دیباچے کا وہ ورق نہیں ہے جس میں مصنّف نے اپنا نام لکھا ہے، اسی لیے احمد منزوی نے اس نسخے کو متعارف کرتے وقت، مصنّف ''ناشناس'' لکھا ہے لیکن نسخے میں ایک دوسری جگہ پر موجود مصنّف کے والد کے نام کا ذکر کیا ہے (منزوی، ج ۱۱، ص ۹۳۲)۔

۲۔مملوکہ شریف کنجاہی مرحوم، گجرات، کاتب قاضی غلام حسین مدرّس بورڈ سکول، گجرات، تاریخ کتابت ۱۲ جون ۱۸۹۹ئ، برائے حافظ غلام احمد ساکن گڑھی شاہ دولا۔ترقیمے میں کاتب نے کتاب کا نام ''شجرۂ شاہ دولا'' لکھا ہے۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی صاحب نے انھی دو نسخوں کی مدد سے اسے مرتّب کیا تھا لیکن یہ اشاعت پذیر نہ ہو سکا۔



کتابیات

1۔ احمد بیگ لاہوری، احوال و مقامات نوشہ گنج بخش، بہ تصحیح و مقابلہ و مقدمہ عارف نوشاہی، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد، ۲۰۰۱ء

2۔ بختاور خان، محمد: آیینۂ بخت، مخطوطہ خلیل الرحمان داودی مرحوم، لاہور

3۔ بختاور خان، محمد: مرآۃ العالم، مرتبہ ساجدہ۔ س۔ علوی، ادارۂ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۷۹ء، ج ۲

4۔ جہان آرا بیگم: رسالہ صاحبیہ، مرتبہ محمد اسلم، پیش کردہ سردار علی احمد خان، لاہور، ۱۹۹۳ء

5۔ چنابی، حکیم مینا: تحفۃ الپنجاب، مخطوطہ، نیشنل آرکائیوز آف پاکستان، اسلام آباد، ذخیرۂ مفتی فضل عظیم بھیروی (نمبر: اسلام ۲۳۱)

6۔ شریف کنجاہی: حضرت شاہ دولا دریائی گجراتی: حیات و تعلیمات، مرکز معارف اولیاء، محکمۂ اوقاف حکومت پنجاب، لاہور، ۱۹۸۵ء

7۔ عبدالفتاح بن میر محمد نعمان بدخشی، مفتاح العارفین، مخطوطہ، لاہور، پنجاب یونی ورسٹی، ذخیرۂ شیرانی، نمبر 4263/1613 مکتوبہ ۲۵ ذی الحجہ ۱۳۰۱ھ

8۔ عبداللہ خویشگی قصوری: معارج الولایت، مخطوطہ، ذخیرۂ آذر، دانشگاہ پنجاب، لاہور، شمارہ H-25/7765

9۔ غلام قدوس: تذکرۂ شیخ قاسم سلیمانی قادری، بہ اہتمام عارف نوشاہی، مشمولہ مقالات عارف، بنیاد موقوفات دکتر محمود افشار، تہران، ۲۰۰۷ء، دفتر دوم

10۔ گوہر نوشاہی، "سوانح حضرت شاہ دولہ: ایک معاصر دستاویز"، دریافت، اسلام آباد، شمارہ ۷، سال ۲۰۰۸ء

11۔ ایضاً (مرتب): تذکرۂ شیخ دولا، دیکھیے: محمد چراغ قادری

12۔ مجتبیٰ فضلی لاہوری: عین التصوف، مخطوطہ، لاہور میوزیم، شمارہ MSS 431، مکتوبہ ۱۲۳۱ھ

13۔ محمد اسلم پسروری: فرحت الناظرین، مترجمہ و مرتبہ محمد ایوب قادری، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، ۱۹۷۲ء
14۔ محمد چراغ قادری: تذکرۂ شیخ دولا، مخطوطہ، گنج بخش، اسلام آباد، شمارہ 2678؛ نیز: مرتبہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، غیر مطبوعہ
15۔ ایضاً (مرتب)، جامع الفنون، دیکھیے: محمد رشید گجراتی
16۔ محمد حیات نوشاہی: تذکرۂ نوشاہیہ، تصحیح و تدوین عارف نوشاہی، ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء
17۔ محمد رشید گجراتی: جامع الفنون، مرتبہ محمد چراغ قادری، مخطوطہ، ذخیرۂ شیرانی، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور، شمارہ 5725/2406
18۔ محمد متین ہاشمی و حافظ غلام حسین: فہرست مخطوطات مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، [۱۹۸۷ء]
19۔ محمود: ملفوظات نقشبندیہ (حالات حضرت بابا شاہ مسافر صاحب اورنگ آبادی نجکی)، نظامت امور مذہبی سرکار عالی، حیدر آباد، ۱۳۵۸ھ
20۔ منزوی، احمد: فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۰ء، ج ۱۱

تخریج اشعار میں معاون اور مرجع ایڈیشن:

1۔ ابوسعید ابوالخیر، سخنان منظوم ابوسعید ابوالخیر، بہ کوشش سعید نفیسی، انتشارات سنائی، تہران، ۱۳۷۰ش، طبع چہارم۔
2۔ حافظ شیرازی، خواجہ شمس الدین محمد، دیوان حافظ، بہ تصحیح و توضیح پرویز ناتل خانلری، انتشارات خوارزمی، تہران ۱۳۶۲ش، طبع دوم۔
3۔ سعدی شیرازی، بوستان، مشمولہ کلیات سعدی، بہ اہتمام محمد علی فروغی، تہران، ۱۳۶۷ش
4۔ سعدی شیرازی، گلستان، بہ کوشش خلیل خطیب رہبر، انتشارات صفی علی شاہ،

تہران، ۱۳۷۴ش، طبع دہم۔

5۔ عراقی، فخر الدین ابراہیم، کلیات عراقی، با مقدمہ و حواشی م۔ درویش، انتشارات جاویدان، تہران، ۱۳۶۶ھ ش

6۔ مولوی رومی، جلال الدین محمد، مثنوی معنوی، بہ کوشش توفیق۔ ھ۔ سبحانی، سازمان چاپ و انتشارات، وزارت فرہنگ وارشاد اسلامی، تہران، ۱۳۷۶ش۔

7۔ نظامی گنجوی، مخزن الاسرار، مشمولہ کلیات نظامی، بہ اہتمام وحید دستگردی، انتشارات گلبان، تہران، ۱۳۸۱ش۔

(یہ مقدمہ پہلی بار ۱۹ اگست ۲۰۱۳ء کو لکھا اور ۱۷ فروری ۲۰۱۴ء کو اس پر نظر ثانی کی گئی۔

عارف نوشاہی، اسلام آباد)

ڈاکٹر گوہر نوشاہی

سوانح حضرت شاہ دولاؒ: ایک معاصر دستاویز

حضرت شاہ دولا علیہ الرحمۃ جنھیں حضرت شاہ دولا دریائی بھی کہا جاتا ہے، برّصغیر کے اکابر اہل اللہ اور صوفیہ میں شمار ہوتے ہیں۔ یوں تو اہل تصوّف کے اکثر سوانحی مآخذ اور تذکروں میں ان کے حالات موجود ہیں، لیکن اس قدر مختصر اور نامرتّب کہ ان کی مدد سے آپ کی زندگی کا کوئی پہلو بھی مکمل طور پر سامنے نہیں آتا۔ یہی سبب ہے کہ ان کی حیات و تعلیمات کی مکمل چھان بین اور تحقیق آج تک نہیں ہو سکی۔ ان کے اکثر سوانحی مآخذ اس قدر تشنہ اور سطحی تھے کہ ان پر کسی طور بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا اور ہمیشہ اس امر کی ضرورت محسوس کی گئی کہ کسی ایسے اصلی اور بنیادی مأخذ تک رسائی ہو سکے جس سے تمام مآخذ فیض یاب ہوئے ہیں۔

چند سال پہلے مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد کے نادر و نایاب ذخیرۂ مخطوطات میں چند پراگندہ اوراق دیکھنے کا اتفاق ہوا جن پر ''تذکرہ حضرت شاہ دولا گجراتی'' اصل مخطوطے سے مختلف خط میں لکھا تھا۔ یہ ۸۴ اوراق تھے جن میں سے بعض مرتّب اور بعض بے ترتیب صورت میں تھے۔ جب ان اوراق کا سرسری مطالعہ کیا تو یہ حیرت افزا مسرت حاصل ہوئی کہ یہ مخطوطہ نہ صرف حضرت شاہ دولاؒ کے سوانح حیات کا ہم عصر اور قدیم ترین مأخذ ہے بلکہ ان کے قدیم و جدید سوانح نگاروں کی معلومات کا بنیادی ذریعہ اور مأخذ بھی ہے۔ مرکز تحقیقات فارسی کے

سرپرست کے لطف خاص سے سوانح حضرت شاہ دولا کے اس اُمّ المآخذ کی عکسی نقل کا مطالعہ شروع کیا جس کے نتائج چند عرائض کی صورت میں پیش خدمت ہیں۔

زیر نظر تصنیف، جس کو مصنّف نے کوئی مخصوص نام یا عنوان دینے کی بجائے احوال واقوال وافعال حضرت شاہ دولاؒ پر ایک رسالہ قرار دیا ہے، حضرت شاہ دولا کے ایک قریبی دوست حضرت شاہ مراد قادری مقیم قصبہ سوک من مضافات شہر گجرات کے فرزند چراغ کی تصنیف ہے۔ کتاب کے بارے میں زمانی اور فنی تفصیلات آئندہ سطور میں آئیں گی۔ اس جگہ یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ چراغ بن شاہ مراد، حضرت شاہ دولا کے تنہا معاصر سوانح نگار ہیں جن کو کئی وسیلوں اور ذرائع سے حضرت شاہ دولا کا قرب حاصل تھا اور شاید یہ تنہا مصنّف ہیں جنھیں حضرت شاہ دولا کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور ان کی شخصیت تک رسائی کا دوسرے ہر مورّخ اور سوانح نگار سے زیادہ موقع نصیب ہوا۔ یہی سبب ہے کہ وہ اس رسالے کے بڑے حصے کے خود راوی، مآخذ اور استناد ہیں۔

اس سے پہلے کہ زیر نظر کتاب میں درج حضرت شاہ دولا کے سوانح کی تفصیلات بیان کی جائیں اور کتاب کے فنی اور تصنیفی محاسن پر گفتگو کی جائے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے مصنّف کے بارے میں کچھ عرض کر دیا جائے تاکہ ان کے کام کی اہمیت اور وقعت پیش نظر رہے۔

حیات مصنّف:

چراغ بن شاہ مراد قادری کی سوانحی تفصیلات کسی مستند حوالے سے دستیاب نہیں ہیں۔ زیر نظر کتاب میں انھوں نے کئی جگہ اپنا ذکر کیا ہے لیکن زیادہ تر ایک راوی کے

طور پر۔ ان معلومات سے مصنّف کے تفصیلی حالات مرتّب نہیں کیے جا سکتے۔ اس سلسلے میں ان کے اپنے بارے میں یہ چند اشارے اہم ہو سکتے ہیں:

۱۔ ''باعث تصنیف'' میں اپنا نام اور ولدیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''محرّر این رسالہ و مؤلف این قبالہ، احقر العباد، فقیر، چراغ بن شاہ مراد قادری، پیش صاحبدلان صوفی مشرب و صافی درونان ارشاد طلب التماس می دارد۔''

۲۔ ایک حکایت میں اپنے والد کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''از زبان قدوۃ الابرار شیخ برخوردار نور اللہ مرقدہٗ یاد دارم کہ می فرمود کہ در ابتدای جوانی چون بشرف بیعت و کلاہ ارادت جناب ارشاد بنیاد فیض مواد حضرت شاہ مراد قادری، کہ پدر بزرگوار این کمترین مخلوق اند، مستعد شدم......''

۳۔ اپنے بچپن اور زمانہ طالب علمی کو یاد کرتے ہوئے حضرت شاہ دولا کی خدمت میں حاضری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''این خاکپای درویشان خدا کیش و گرد راہِ سینہ صافان حق اندیش در عمر طفولیت چون روز آدینہ از درس آزادی می یافت، مادر مہربان چند نان و سبزی پختہ، حوالہ می کرد و اجازت می داد کہ بخدمت شیخ رفتہ بگذران و دعای دربارۂ خود درخواہ۔''

۴۔ حضرت شاہ دولاؒ کے مرض الموت سے پہلے سوق احمد تشریف لانے پر لکھا ہے:

''و بوقت چاشت در موضع سوق احمد، کہ وطن مالوفہ این داعی است، تشریف آوردند...... این فدوی قربان صاحبدلان مقدار دو گھڑی فیض یاب حضور بود۔''

۵۔ کتاب میں ایک جگہ اپنے استاد مولانا عبدالرحمن جامی کا ذکر بھی کیا ہے اور ان کی کہی ہوئی ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی تاریخ وفات درج کی ہے۔

ان معلومات کے علاوہ صرف ایک بات مصنّف کے والد کے بارے میں اس کتاب کے حوالے سے کہی جاسکتی ہے کہ حضرت شاہ مراد قادری ایک صاحب ارشاد درویش تھے اور ان کے مریدوں کی معقول تعداد تھی۔ چراغ قادری نے زیر نظر کتاب میں ان کے ایک مرید شیخ برخوردار کی زبانی ایک واقعہ درج کیا ہے۔ فارسی، اردو اور پنجابی ادب کے محققین اور تاریخِ گجرات سے دلچسپی رکھنے والے جن مورّخین نے چراغ بن شاہ مراد کے سوانح میں تلاش و جستجو کی ہے ان میں سے کوئی بھی نتیجہ خیز بات نہیں کرسکا۔ پنجابی ادب کے مورخین نے انھیں شاہ چراغ چوہانوی کہہ کر صاحب سیف الملوک میاں محمد بخش کا درج ذیل شعر ان کے اعتراف میں ڈال دیا ہے:

شاہ چراغ ہویا اک سیّد دیوا دین ونی دا
دھنی ملک مکان اونہا دا وچ چوہان سدیندا

اسی شعر کے قیاس پر انور بیگ اعوان (دھنی ادب و ثقافت) عبدالغفور قریشی (پنجابی ادب دی کہانی) اور ڈاکٹر احمد حسین قریشی قلعداری نے ان کا پنجابی ستوارہ اور امام حسین دی وار دریافت کیے، لیکن میرے نزدیک ان میں سے اکثر باتیں قیاس آرائیوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں کیونکہ ان کا انحصار کسی مستند مآخذ پر نہیں [ہے]۔

چراغ قادری کے سوانح کی کھوج لگانے میں سب سے سنجیدہ اور اچھے نکات پروفیسر قریشی احمد حسین قلعداری نے اٹھائے ہیں، لیکن ان کی تحریریں بھی الجھاؤ کا شکار ہیں۔ مثال کے طور پر ''امام حسین دی وار'' کے تعارف میں وہ کسی دلیل یا مستند ذریعے سے یہ ثابت نہیں کرسکے کہ شاہ چراغ چوہانوی ہی شاہ چراغ قادری مصنّف تذکرہ حضرت شاہ دولاؒ ہیں؛ اور ستوارے کی اندرونی شہادتیں تو ایک ایسے شاہ چراغ

کی نشاندہی کر رہی ہیں جو حضرت عبدالرحمن عرف پاک رحمن بھڑی والوں کی وساطت سے حضرت نوشہ گنج بخش قادری بانیٔ سلسلۂ نوشاہیہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں ستوارے سے دو مثالیں کافی ہوں گی۔ حضرت غوث الاعظمؒ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱۔ آیت وار:

ایہہ چڑھدے ایت ڈٹھی ساعت چڑھدے شوم کوَلے نیں
جانی دشمن نال ''نوشہ'' دے بولن بول اَولے نیں
وچ جناب تساڈی میراں کس دے کرم سوَلے نیں
''پاک'' جمال وکھال جیلانی وقت نسے سب زنگی دا
پیر میراں توں پہنچ شتابی وقت مرے سر تنگی دا

۲۔ جمعہ:

جمعہ روز بیثاق ہن چڑھیا، وگی قلم ہن منی میں
سفر لمبے نا سردی اتے، خرچ نہ پایا کنی میں
شاہ چراغ ہن تائیں جاپے ''نوشہ'' اگے منی میں
غوث الاعظم ضامن میرا دوہوں جہانی تنگی دا
پیر میراں ہن پہنچ شتابی، وقت مرے سر تنگی دا

پہلے بند میں حضرت نوشہ صاحب اور حضرت پاک صاحب دونوں کا اور دوسرے بند میں حضرت نوشہ گنج بخش کا ذکر واضح طور پر موجود ہے۔

ڈاکٹر احمد حسین قلعداری نے چراغ بن شاہ مراد قادری کو گیلانی سیّد لکھا ہے اور

روحانی مسلک کے لحاظ سے انھیں حضرت امام امی علیہ الرحمۃ سکنہ ڈھوک نڑال کے فیض یافتہ قرار دیا ہے۔ آپ کے آباواجداد موضع سوق احمد، تحصیل وضلع گجرات کے رہنے والے تھے۔ والد کا نام سید شاہ مراد اور دادا کا نام سید شاہ اسماعیل تھا۔ جن کے مزارات ان کے آبائی قبرستان موضع سوق احمد میں موجود ہیں۔ یہ قصبہ اب چھوٹے کاف سے صرف سوک کہلاتا ہے۔ ڈاکٹر قلعداری کا خیال ہے کہ اہل سوق کی بدعہدی کے سبب چراغ قادری ترک وطن کر کے موضع کنڈ خیل واقع علاقہ پوٹھوہار میں چلے آئے۔ اور بعد میں علاقہ دھنی کے موضع چوہان کو مستقل رہائش کے لیے اختیار کیا اور یہیں دفن ہوئے۔ آپ کی کثیر اولاد موجود ہے۔

ڈاکٹر قلعداری صاحبِ علم وفضل محقق اور مورّخ ہیں، لیکن چراغ قادری کے بارے میں انھوں نے اپنی معلومات کے جو مآخذ بیان کیے ہیں ان میں سے کوئی بھی قدیم اور مستند نہیں۔ البتہ جب تک کوئی مستند ذریعہ اور مآخذ سامنے نہیں آتا اس ناقص مواد پر اکتفا کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔ ڈاکٹر قلعداری خود بھی اپنی معلومات سے مطمئن نہیں ہیں، چنانچہ انھوں نے ''شاہ چراغ چوہانوی تے امام حسین دی وار'' والے مضمون کے آخر میں تذکرۂ حضرت شاہ دولا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس بات کا پتہ نہیں چل سکا کہ چراغ قادری کب اور کیوں سوق سے ترک وطن کر کے چوہان گئے؟ اسی کتاب کے ذکر میں ڈاکٹر قلعداری نے چراغ بن شاہ مراد کے استاد مولانا عبدالرحمن جامی کے بارے میں نہایت عمدہ معلومات فراہم کی ہیں جو درج ذیل ہیں۔ اصل عبارت پنجابی میں ہے یہاں اس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

''حضرت شاہ چراغ قادری نے اس کتاب میں اپنے استاد مولوی

عبدالرحمن جامی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ مولوی عبدالرحمن جامی اپنے وقت کے بہت بڑے عالم دین تھے اور ان کی وجہ سے اس زمانے میں موضع سوق علم وادب کا بہت بڑا مرکز مانا جاتا تھا۔ مولوی صاحب کے فتوے اورنگ عالمگیر کے دربار تک جاتے تھے۔ مولوی عبدالرحمن جامی کے بیٹے مولوی عبدالنبی نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں سے نجات المسلمین، دُرّ الفرائض اور جامع الخیرات کے قلمی نسخے اب بھی موجود ہیں، مولوی عبدالنبی کے بعد ان کی مسند ان کے بیٹے مولوی محمد صالح نے سنبھالی اور ان کے بعد قاضی محمد سعید شاہی صاحبِ فتویٰ ہوئے اور شاہی فرامین اور دستاویزات پر آپ کی مہر لگتی تھی۔ ان کے بعد سکھوں کے زمانے میں ان کی اولاد میں سے حافظ اللہ یار نے عزت ووقار حاصل کیا۔ حافظ صاحب موصوف کا روضہ موضع سوق احمد میں موجود ہے۔“

چراغ بن شاہ مراد قادری کی اولاد کے بارے میں انور بیگ اعوان کی یہ اطلاع کہ شاہ میر غلام کے نام سے ان کا ایک بیٹا بھی شاعر تھا اور اس کی ایک کافی بھی موجود ہے تحقیقی اعتبار سے استناد کی محتاج ہے۔ ڈاکٹر قلعداری نے جس مدح غوث الاعظم پر میر غلام بن چراغ قادری کی تصنیف ہونے کا گمان کیا ہے عین الحق فرید کوٹی کے بقول وہ مدح مفتی غلام سرور لاہوری کی تصنیف ہے۔ اسی طرح انور بیگ اعوان کا یہ بیان کہ چراغ بن شاہ مراد قادری [۱۲۹۲ھ] ۱۸۷۵ء میں فوت ہوئے نہ صرف چراغ بن شاہ مراد کی پنجابی زبان کا شاعر ہونے کی حیثیت کو مشکوک کرتا ہے بلکہ زمانی

اعتبار سے بھی نا قابلِ یقین ہے۔

بہر حال یہ تھا اندرونی اور بیرونی شہادتوں سے چراغ بن شاہ مراد قادری کا سوانحی خاکہ۔ ان مبہم نقوش میں رنگ بھرنے کے لیے آیئے ایک بار پھر زیر نظر کتاب یعنی تذکرۂ حضرت شاہ دولا کے متن سے رجوع کرتے ہیں:

چراغ بن شاہ مراد قادری نے حضرت شاہ دولاؒ کی خدمت میں اپنی اولین حاضری کی جو تفصیل بیان کی ہے اس کی پوری عبارت قابل توجہ ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"این خاکپای درویشانِ خدا کیش و گردِ راہ سینہ صافان حق اندیش، در عمر طفولیت، چون روز آدینہ، از درس آزادی می یافت، مادر مہربان چند نان و سبزی پختہ حوالہ می کرد و اجازت می داد کہ بخدمت شیخ رفتہ بگذران و دعای دربارۂ خود درخواہ۔ ہمچنان می کردم و شیخ از راہ لطف و کرم بر یتیمیِ من بسیار توجہ و مہربانی می فرمودند و ہر چہ نذر می آمد بحسب قسمت می بخشیدند۔"

گمان ہوتا ہے کہ اس واقعے کے وقت چراغ بن شاہ مراد کی عمر دس بارہ برس سے زیادہ نہ ہوگی اور وہ اس عمر سے پہلے اپنے والد کی سرپرستی اور سایۂ عاطفت سے محروم ہو چکے ہوں گے اور یقیناً ان حالات میں انھیں پدرانہ شفقت کی کمی محسوس ہوتی ہوگی۔ جس کے بعد حضرت شاہ دولا ان کی یتیمی پر توجہ فرماتے تھے۔ اس توجہ اور لطف خاص کا ایک سبب یہ بھی ہوگا کہ چراغ قادری کے والد حضرت شاہ مراد قادری اور حضرت شاہ دولا کے درمیان دوستی اور مودّت کا ایک سلسلہ عرصۂ دراز سے قائم تھا۔

اس بات کو مصنفِ تذکرہ کی بیان کی ہوئی ایک حکایت سے بھی تقویت ملتی ہے جس کی راوی خود ان کی والدہ یعنی حضرت شاہ مراد قادری کی بیوہ ہیں:

"مشفقہ مکرمہ مادر مہربان من می گفت کہ چوں پدر تو بعروسی مرا در خانۂ خود آورد، شیخ دولا در وجہ تنبول بسیار چیزہا عنایت فرمودند۔ از آن جملہ یک روپیہ بخشیدند و فرمودند کہ این نقد را در دست امام زادہ سیدۂ من بدہید و بگوئید کہ فال دولت است ہمیشہ در دست خود نگاہ داشتہ باشد۔ گاہی از رزق و مال کمی و غمی نخواہد دید۔ پدرت آن نقد را انگشتانہ از زرگر راست کنانیدہ در انگشت دست من انداخت از آن دیر باز بغایت حال مدت پنجاہ سالہ گذشتہ باشد کہ آن انگشتانہ در دست دارم۔ ببرکت تبرّک شیخ این ہمہ عمر مالدار و صاحب اعتبار ماندم و در قحط و ارزانی عزلت رزق ندیدم۔"

اس اقتباس سے جن اہم نکات پر روشنی پڑتی ہے، ان میں سے:

ایک یہ ہے کہ حضرت شاہ دولا حضرت شاہ مراد قادری سے سن و سال میں بڑے ہوں گے۔ کیونکہ خیر و برکت کی دعا بزرگ، چھوٹے کو دیتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ تذکرۂ حضرت شاہ دولا کی تألیف کے وقت مصنّف کی والدہ بھی وفات پا چکی تھیں۔

تیسرے یہ کہ مصنّف کی والدہ کی وفات حضرت شاہ دولا کی رحلت سے پہلے واقع ہوئی تھی۔

اور چوتھے یہ کہ مصنّف کی والدہ اپنی شادی کے پچاس سال بعد تک زندہ

رہیں جس سے اس حقیقت تک پہنچنا مشکل نہیں کہ تذکرہ حضرت شاہ دولا کی تصنیف کے وقت چراغ بن شاہ مراد قادری کی عمر چالیس سال سے یقیناً تجاوز کر چکی تھی اور اگر یہ قیاس درست ہے تو انھوں نے حضرت شاہ دولا کی بچپن سے جوانی تک خاصا طویل عرصہ زیارت کی ہوگی اور انھیں نزدیک سے دیکھا ہوگا۔ اس امر کا ثبوت کتاب کے متعدد مقامات سے ملتا ہے جن میں وہ خود راوی اور عینی شاہد کے طور پر قاری سے ہمکلام ہوئے ہیں۔

باعثِ تصنیف و زمانۂ تالیف:

تذکرہ حضرت شاہ دولا کی اندرونی شہادتوں سے واضح ہوتا ہے کہ مصنّف نے کتاب کی تصنیف کا کام حضرت شاہ دولا کے وصال یعنی ۱۵ ربیع الاول ۱۰۸۶ھ کے تھوڑے عرصے بعد ہی شروع کر دیا تھا کیونکہ اکثر روایت کنندگان حضرت شاہ دولا سے ملاقات کر چکے تھے اور ان کے احوال و مقامات سے واقف تھے۔ کتاب کے سبب تالیف میں مصنّف نے اپنے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"از ابتدای آفرینش عالم تا انتہای قیامت ہیچ زمان و مکان خالی از مردان خدا و راہ روان شیدا نیست...... و ہمیشہ وجود شریف این طایفۂ عالیہ مستعد جلوہ گری است۔ بلکہ قوام زمین و زمان و انتظام عالم عالمیان بقوام ذات پاک ایشان است والبتہ ہر گاہ این طبقہ بلکر تبہ روی ظہور در پردۂ کتمان خواہند نشست، استحکام پیوند عالم خواہد شکست...... و اکثر قوم نافہم کور باطن بقیاس بی اساس خود باین رفتہ اند کہ در عہد ماضی این زمرہ عالیہ بلکر تبہ گزشتہ رفتہ در این زمان کسی از آنہا

موجود نیست کہ ارادت بہ اوتوان آورد و سعادت ارشاد توان برداشت۔ این دلیل ایشان محض برنادانی و نایافت مقصود خبر می دہد۔ شاید دراین وہم افتادہ اند کہ ہرچہ نصیب آنہا شد، می تواند کہ در تمام عالم نباشد...... بنا برآن از واردات غیبی وطہارت لاریبی در خاطرم چنان ریختند کہ برخی از حال واحوال وافعال واقوال عارفان زمان کہ بہ چشم خود دیدہ و بہ گوش خود شنیدہ شد در قید قلم آرم، در پس ماندگان مایہ کار بگذارم۔ اما چون بہ فکر تمام در خود نگریستم قابوی شرح احوال ہر کدام مشائخ از قید خویش بیرون یافتم وفرصت ہم اندک بہ نظر آمد۔ لاچار مشتی از نمونہ خرواری وتضاعف یک یک شمار ہزاری، بعضی از احوال مقرب مولا، شیخ دولا قدس سرہ العزیز چیدم و بہ طریق تبرک در ترقیم آن قلم را نگار بستم۔ اگرچہ احوالات و مقامات آنحضرت بہ حدی بود کہ صورت احوال یک ذرہ از عمر گرامی ایشان توان نوشت، اما قطرہ ای از دریا و شمہ ای از بوی صبا و جرعہ ای از خم صہبا اختیار کردہ ام تا بہ وسیلۂ آن از دامن اہل اللہ محروم نمانم۔"

اس طویل بیان میں مصنّف نے اپنے کام کے مقاصد پر جو بنیادی نکات اٹھائے ہیں ان پر توجہ ضروری ہے:

۱۔ مصنّف کا عقیدہ ہے کہ یہ نظام عالم بزرگان دین کی روحانی اور اخلاقی اقدار اور تعلیمات پر استوار ہے۔

۲۔ وہ ایسے صاحبان حال وقال عارفان زمانہ کے حالات زندگی لکھنا چاہتے ہیں جن

کے احوال و افعال کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان کے روحانی مراتب کے بارے میں اپنے کانوں سے سنا ہے۔

۳۔ ان کے پاس زندگی کی زیادہ مہلت نہیں لہٰذا انھوں نے اس مقصد کے لیے حضرت شاہ دولا علیہ الرحمۃ کے حالات زندگی کو منتخب کیا ہے۔ اس نکتے کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی اس نتیجے پر پہنچنا مشکل نہیں کہ مصنّف زیر نظر کتاب کے زمانۂ تصنیف کے وقت بزرگی اور پختہ سالی کی حدوں کو چھو رہے تھے۔

مصنّف نے کتاب کے زمانۂ تصنیف کا کہیں تعین نہیں کیا۔ بعض ایسے اشارات موجود ہیں جن سے سال تصنیف کا تعین ممکن ہے لیکن افسوس کہ وہ اشارے بھی تاریخی اعتبار سے حل طلب اور غیر واضح ہیں مثال کے طور پر مصنّف نے لکھا ہے کہ نالہ ڈیک یعنی ''دیوگہ'' کے پل کو تعمیر ہوئے پچاس برس گزر چکے ہیں۔ جبکہ کسی تاریخی حوالے سے معلوم نہیں کہ نالہ ڈیک کا وہ پل جو حضرت شاہ دولا نے تعمیر کروایا تھا کس سال پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ البتہ کتاب میں ایک مقام ایسا ہے جہاں سے اس کتاب کے سال تصنیف کا عقدہ حل ہو جاتا ہے۔ حضرت شاہ دولا کے ابتدائی حالات میں لکھا ہے کہ حضرت شیدا سرمست کے وصال کے بعد آپ پھگوانی پورہ کی سکونت ترک کر کے سخی سیالکوٹ میں آ گئے تھے اور وہاں آپ نے ایک وسیع تالاب اور خوش آب و ہوا باغ تعمیر کیا جو اَب مولوی عبداللہ کے ہاتھوں ویران ہو چکا ہے۔ اصل عبارت درج ذیل ہے۔

''القصہ، مدت دہ سال شیخ در قصبہ سیالکوٹ تشریف داشتند و تسخیر و رجوع عام و خواص ہمیشہ رو بہ افزونی بود و یک تالاب عظیم و باغ خوش

نسیم، کہ بالفعل مولوی عبداللہ آن ہر دو جار اویران ساختہ محلہ خود آباد کردہ است، مرتّب فرمودند۔"

یہ مولوی محمد عبداللہ سیالکوٹی جنھیں لاہوری بھی لکھا جاتا ہے اگر ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی کے فرزند ہیں۔ جو ۱۰۹۴ھ / ۱۶۸۳ء میں فوت ہوئے اور کتاب میں ذکر کے دوران وہ زندہ تھے، تو تذکرہ حضرت شاہ دولا کا حضرت شاہ دولا کی وفات یعنی ۱۰۸۶ھ اور مولوی عبداللہ سیالکوٹی کی وفات یعنی ۱۰۹۴ھ کے درمیان لکھا جانا قرین صحت ہے۔

تذکرہ حضرت شاہ دولا کے مآخذ ومنابع:

چراغ بن شاہ مراد قادری نے اپنی تصنیف کو چار مختلف مآخذ پر استوار کیا ہے۔

الف۔ سینہ بسینہ حاصل ہونے والی معلومات:

کتاب کے پہلے حصے میں حضرت شاہ دولا کے خاندان، حسب ونسب اور پیر طریقت میں حضرت شاہ دولا کے خاندان اور نسب اور پیر طریقت حضرت شیدا سرمست کے بارے میں جملہ معلومات اسی زمرے میں آتی ہیں، مصنّف نے اس سلسلے میں حضرت شاہ دولا کے حاضر باشوں اور قربت رکھنے والے اشخاص سے استفادہ کیا ہے اور اس سلسلے میں مورّخانہ چھان بین اور کسی قسم کی زمانی تطبیق کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ لیکن ان شنیدہ روایات کو بھی مصنّف نے جس منطقی اور ادبی حسن کے ساتھ پیش کیا ہے وہ ان کے کمال فن کی دلیل ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اعلیٰ مثال حضرت شیدا سرمست کی شخصیت کا خاکہ ہے جس میں ان کی شخصیت اس قدر پُرعظمت اور الٰہیاتی دکھائی دیتی ہے کہ اس کے سامنے تاریخی سچائیاں بے حقیقت نظر

آتی ہیں۔ ویسے بھی روحانی ضابطۂ حیات کے مکاشفات اور استعاروں سے رونما ہونے والے حالات و واقعات کو تاریخی مطابقت دینا ضروری نہیں ہوتا۔ تاریخ کی دی ہوئی معلومات بھی شکوک وشبہات سے پاک نہیں ہوتیں۔ عینی شاہدوں کے مقابلے میں تاریخ میں ضبط شدہ معلومات دوسرے درجے کا مآخذ ہوتی ہیں۔ تاریخ نویسی میں مصلحتوں، فنی پیچیدگیوں شخصی تعصبات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ پھر مواد تک رسائی اور حقائق کی تہہ تک پہنچ سکنے کی استعداد بھی کسی مورّخ کے ضعف یا استناد کا تعین کرتی ہے۔ معلوم نہیں عزّت خان ولد سلطان شادمان خان گکھڑ کی روایت چراغ بن شاہ مراد تک کس وسیلے سے پہنچی۔ براہ راست کی بجائے ممکن ہے بالواسطہ آئی ہو۔ تاہم سوائے بہمنی والی ایک حکایت کے تمام روایات اس قدر فطری اور صداقت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں کہ حضرت شاہ دولا کی زندگی کی ان جزئیات پر ذرّہ بھر بھی شبہ کرنے کو دل نہیں چاہتا اور تاریخ کے تانے بانے جتنے بھی اس سے متصادم ہوں عقل گواہی دیتی ہے حضرت شاہ دولاؒ کی ابتدائی زندگی کی داستان کچھ اسی طرح کی ہوگی اور حضرت شیدا سرمست کی اسی شخصیت نے حضرت شاہ دولا کی روحانی تربیت کر کے انھیں اعلیٰ مدارج تک پہنچایا ہوگا۔ انسان شناسی کے جدید مفکرین کا بھی یہی کہنا ہے کہ انسانی شخصیت کی ساخت اور فکر و احساس کی تعمیر کے لیے تاریخی پس منظر اور تاریخی حقائق کی چھان بین ضروری اور اہم نہیں۔ سماجی پس منظر معاشرتی پیش منظر اور رسوم و رواج کا تار و پود اس سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ اشیاء کو نسلی جوہر میں نہیں، باہمی تعلقات میں دیکھنا چاہیے۔ یعنی انسانوں کے لیے نسلی شجروں سے اہم سماجی روابط اور رشتے ہوتے ہیں اور ظاہر ہے اہل تصوف اور صاحبان طریقت سے زیادہ یہ نظریہ کس

پر صادق آئے گا۔

چراغ بن شاہ مراد نے حضرت شاہ دولا کے ابتدائی حالات کچھ اس طرح بیان کیے ہیں۔ فارسی متن کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے:

''عزّت خاں ولد سلطان شادمان خان گکھڑ کے استفسار پر حضرت شاہ دولا نے اپنے ابتدائی حالات زندگی بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کے والد عبدالرحیم لودھی افغان تھے جو سلطان سکندر لودھی کے ہم قوم اور ہم قبیلہ تھے۔ حضرت کی والدہ نعمت خاتون غازی خان بن سلطان سارنگ کی نواسی تھیں۔ افغانوں کی یلغار میں ان کی نانی سلطان سارنگ کی شہادت کے بعد گرفتار ہوئیں۔ اس وقت ان کی والدہ ماں کے دودھ پر تھیں۔ حضرت شاہ دولا اکبر بادشاہ کے پچیسویں سال جلوس میں ۹۸۹ھ / ۱۵۸۱ء [کذا: ۹۸۷ھ/۱۵۷۹ئ] کے قریب پیدا ہوئے۔ ان کے والد سپاہی پیشہ تھے جو حضرت شاہ دولا کی ولادت کے ایک سال بعد ہی فوت ہو گئے۔ حضرت کی والدہ بیوگی کی حالت میں غربت اور عدت کی زندگی گزارتے ہوئے پوٹھوہار کے علاقے میں آ گئیں۔ پانچ سال تک دانگلی پھروالا کے گاؤں سہالہ میں محنت مزدور کر کے اپنا اور اپنے بچے کا پیٹ پالا۔ پھر رہتاس کے ایک موضع کالا میں آ گئیں اور چار سال بعد اسی جگہ فوت ہو گئیں۔''

''والدہ کی وفات پر حضرت شاہ دولا کی عمر دس گیارہ برس سے زیادہ نہ تھی۔ آپ یتیمی اور بیکسی کی حالت میں دربدر بھٹکتے اور گدائی کرتے قصبہ سنجی سیالکوٹ پہنچے۔ ایک بے اولاد شخص مہتا کھیما نے انھیں اپنی فرزندی میں لے لیا۔ بعد ازیں اس کے علاقے کے قانونگویوں نے انھیں لے کر اپنے مال و اسباب کا امین مقرر کیا۔ پھر چوری

اور خیانت کا الزام لگا کر درپے آزار ہوئے۔ حضرت کی بے گناہی ثابت ہوئی۔ نوکری سے آزاد کیے گئے لیکن اس واقعے نے دنیا سے ان کا تعلق منقطع کر دیا۔ اب آپ تلاش حق اور مرشد برحق کی جستجو میں کمر بستہ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں موضع بھگوانی پورہ پہنچا کر مجذوب وقت حضرت شیدا سرمست کے صومعے میں باریاب کیا۔ حضرت سرمست کے خادم منگو کا دل ان پر مہربان ہوا اور آپ اپنے مرشد اور برادر طریقت کے لیے خدمت گدائی پر مامور ہوئے۔ حضرت شیدا سرمست نے انھیں کاسۂ گدائی ترک کر کے محنت مزدوری کے ذریعے رزق حلال کی طرف مائل کیا۔ انھیں محنت کشی اور دست و بازِو پر انحصار میں پوشیدہ رموز و اسرار الٰہیہ سے آگاہ کیا اور یہ آگاہی ان کے غرور و نخوت اور نفس امارہ پر غلبہ حاصل کرنے کا ذریعہ قرار پائی۔"

"حضرت شاہ دولا بارہ سال تک حضرت شیدا سرمست کی خدمت میں رہے ان کی مرض الموت کے دوران ان پر جان و دل نچھاور کیے خدا نے ان کی فریاد سنی اور حضرت شیدا سرمست نے وصال کے وقت حضرت شاہ دولا کو خرقۂ خلافت اور رشد و ہدایت کا اِذن عطا فرمایا جس سے ظاہر و باطن کے تمام اسرار حضرت پر کھل گئے اور حضرت سرمست کے الفاظ کہ: "بیا اے دولا، جسے دے تسے مولا" نے چار دانگ عالم کو آپ کے زیر فرمان کر دیا اور "دم ہو دولا دریائی" کے نعرے ہر طرف بلند ہونے لگے۔"

حضرت شیدا سرمست سلسلۂ مجذوبیہ سے تعلق رکھتے تھے اور آپ کا شجرۂ طریقت کئی واسطوں سے قاتل کفار حضرت امام علی الحق سیالکوٹی سے ملتا تھا۔ اس

طرح:

’’شیخ دولا قدس سرہٗ العزیز خرقۂ درویشی از دست شاہ شیدا سرمست پوشیدہ اند و ایشان از شاہ مونگا، وایشان از شاہ تن برہنہ، و ایشان از حافظ بیابانی، وایشان از سید طاہر، وایشان از امام ناصر۔‘‘

ان سے آگے ہر چند کہ صاحب تذکرۂ شاہ دولا نے نام نہیں دیے تاہم لکھا ہے:

’’پیشتر ازین سند خلافت کرسی بمن نرسیدہ است، اما از زبان شیخ دولا سند دارم کہ می فرمودند کہ سلسلۂ ما بہ امام قاتل الکفار محی الاسلام امام علی الحق رحمۃ اللہ علیہ می پیوندد۔‘‘

حضرت سرمست کی وفات کے بعد حضرت شاہ دولا کو حضرت امام علی الحق کی جانب سے اشارہ ہوا کہ آپ خلق خدا کی رشد و ہدایت کے لیے بھگوانی پورہ اور سیالکوٹ کو ترک کر کے گجرات چلے جائیں۔ چنانچہ آپ اس حکم کی تعمیل میں گجرات آ گئے اور شہر کے درمیان ایک نالے کے نشیبی حصے کو مٹی سے پُر کر کے اس پر اپنے حجرے اور خانقاہ کی بنیاد رکھی اور خلق خدا کی ظاہری اور باطنی تربیت میں مصروف ہو گئے۔

یہاں تک کتاب کے سینہ بسینہ روایات پر مبنی مآخذ ختم ہوئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم کتاب کے مصادر کی دوسری نوع کی طرف رجوع کریں، چراغ بن شاہ مراد نے حضرت شیدا سرمستؒ کی شخصیت کا جو مرقع پیش کیا ہے اس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمالیجیے۔ اصل فارسی عبارتوں کے یہاں اردو تراجم پیش کیے جاتے ہیں:

’’حضرت شاہ (سید سرمست) کی کیفیت یہ تھی کہ بحر توحید میں دور تک غوطہ زنی کے باعث جذب و تفرید تک رسائی حاصل کر چکے تھے اور فنا

فی اللہ اور بقا باللہ کے مقامات سے سرفراز تھے اور اگر کوئی خیر اور شر کا کلمہ زبان مبارک سے سرزد ہو جاتا تو اس کا اثر فی الفور ظاہر ہو جاتا تھا۔"

"شیخ (دولا) نور اللہ مرقدہٗ فرماتے تھے ایک دن شاہ (شیدا سرمست) نے غصے کی حالت میں مجھ سے فرمایا کہ اے غلام تو ہر روز ایسے نوالے میرے لیے لاتا ہے جو لوگوں کے منہ کے لعاب اور دانتوں سے آلودہ ہوتے ہیں جنھیں کھانے کو میرا دل نہیں چاہتا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تو اپنے دس ناخنوں کی محنت سے ایسی پاکیزہ غذا میرے لیے لائے جسے میں رغبت سے کھا سکوں؟ اس ارشاد کی تعمیل میں میں نے پھاوڑا کاندھے پر رکھا اور سیالکوٹ کی طرف روانہ ہو گیا...... اس دن میں نے اللہ تعالیٰ کی مدد سے ستر ہاتھ لمبی اور ایک ہاتھ چوڑی ایک قدیم عمارت کی کھدائی کی اور اس میں سے اینٹیں نکالیں۔ منتظمین نے دیکھا تو آپس میں کہنے لگے یہ کام کسی آدم زاد کا معلوم نہیں ہوتا...... میں نے بازار جا کر دو تنکے کی کھچڑی (یعنی چاول اور دال)، تین تنکے کا گھی اور ایک تنکے کی لکڑیاں خریدیں اور غذا تیار کر کے حضرت شاہ (سرمست) کی خدمت میں حاضر کی۔ شاہ نے مجھے دیکھ کر تبسم فرمایا اور محبت آمیز گالیوں کے ساتھ کہا کہ اے غلام تو سمجھتا ہے کہ آج تو نے بہت محنت اور مستعدی سے کام کیا ہے، تو نہیں جانتا کہ اس تمام دن کی محنت میں شیدا تیرے ساتھ شریک تھا۔ آ اور دیکھ کہ پھاوڑا چلانے کے سبب میرے ہاتھ چھالوں سے کس قدر بھر گئے ہیں اور فی الحقیقت جب میں نے دیکھا تو شاہ (شیدا) کے دونوں ہاتھوں پر چھالے اس طرح نمودار ہو رہے تھے جیسے پھولوں کی پتیوں پر شبنم کے قطرے۔ کھچڑی کے چند لقمے کھانے کے بعد

فرمایا ''آج مجھے کھانے کا مزا آیا ہے۔ دس ناخن کی محنت چیز ہی اور ہے۔''

''(حضرت شاہ دولا نے فرمایا) میں حضرت شاہؒ (شیدا سرمست) کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بے حد لطف و عنایات سے فرمایا اے غلام تیرے وجود میں خودی اور نفسانیت کی اتنی ہی مقدار تھی جو تجھ سے جدا ہو گئی ہے اور اب غیر اللہ کی کدورت کی جگہ ذات باری تعالیٰ کی معرفت نے لے لی ہے۔ اطمینان رکھ کہ اب تو ہماری عنایات کے قابل اور معرفت الٰہی کے لائق ہو چکا ہے۔''

''(حضرت شاہ دولاؒ نے فرمایا) جب میں شاہؒ (شیدا سرمست) کے نزدیک ہوا شاہ نے وصیت فرمائی کہ اس گدڑی کو سنبھال کر رکھ یہ تیری زندگی کی پردہ پوش ہو گی اور میرے بعد دھونی کی آگ کو ہمیشہ جلتا رکھ کہ تیری درویشی کا فروغ ہمیشہ اس سے قائم رہے گا۔ آ اور اپنا منہ میرے منہ پر رکھ۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ حضرت نے تین مرتبہ اللہ، اللہ، اللہ کہا، اپنی سانس میرے منہ میں ڈالی، ساکت ہو گئے اور اپنی جان خالق حقیقی کے سپرد کر دی۔''

آیئے اب ہم چراغ بن شاہ مراد کے بیان کردہ دوسرے مآخذ اور منابع پر توجہ کرتے ہیں۔

ب۔ آنکھوں دیکھے اور کانوں سنے واقعات:

اس نوع کی معلومات میں مصنّف کتاب چراغ بن شاہ مراد خود راوی اور شاہد کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ان میں سے اکثر واقعات حضرت شاہ دولاؒ کی گجرات

میں تشریف آوری کے بعد کے ہیں:

۱۔ ''حضرت شاہ دولاؒ کی زبانی یہ بات میرے پاس سند کے طور پر ہے کہ فرمایا ہمارا سلسلہ (طریقت) قاتل الکفار محی الاسلام حضرت امام علی الحق علیہ الرحمۃ تک پہنچتا ہے۔''

۲۔ ''درویشوں کا یہ خاکِ پا (یعنی مصنّف) لڑکپن کی عمر میں جب جمعے کے روز مدرسے سے فارغ ہوتا تھا، میری مہربان والدہ مجھے اجازت دیتی تھیں کہ حضرت شیخ (دولا) کی خدمت میں جاؤ اور اپنے لیے ان سے دعا کی درخواست کرو۔ میں ایسا ہی کیا کرتا تھا...... اللہ تعالیٰ کی قدرت کا جو جلوہ میں نے اپنی آنکھوں سے ان کی محفل میں دیکھا یہ ہے کہ شیخ کی خدمت میں ہر وقت عامۃ الناس کا ہجوم رہتا تھا، اور لوگ ان کے گرد دیوار کی طرح چنے رہتے تھے۔''

۳۔ ''جو کچھ اس صاحبانِ دل کے آستانوں کے خاکروب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا کچھ بھی کم و زیادہ کیے بغیر سچائی پسند منصف مزاجوں کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ فی الحقیقت سید محمد فاضل میدان شریعت کے مرد اور اصل و فرع پر حاوی تھے۔ وہ صاحب علم و فضل، اہل توکل، صاحب تقوی و عمل، نجیب الطرفین سیّد، عالم باعمل، صاحب استغناء، راستی پسند اور راست عمل تھے۔''

ج۔ عینی شاہدوں اور حضرت شاہ دولاؒ کے ملاقاتیوں سے براہِ راست استفادہ:

۱۔ ''(بابا) سدّو کہتے ہیں کہ جب میں حاضر ہوا، شیخ (دولا) ایک اندھیرے کمرے

میں بیٹھے تھے۔ میرے جانے پر غیب سے ایک شمع روشن ہوگئی۔ دیکھتا کیا ہوں کے کمرے کے ایک کونے میں سونے کا ایک ڈھیر لگا ہوا ہے۔"

۲۔ "چھمی کہتی ہے شیخ (دولا) کے الفاظ کے اثر سے میرے چرخہ کاتنے میں اتنی برکت ہوتی کہ اگر ایک روئی کی پونی ہاتھ میں لے کر کاتتی تھی تو سات دھاگے کی چھلیاں تکلے سے اترتی تھیں۔"

۳۔ "چوہدری عیسیٰ کہتے ہیں کہ میرے والد چوہدری بیگ نے سخت بخار کی حالت میں مجھ سے کہا کہ شیخ (دولا) کی خدمت میں حاضر ہو کر میرے لیے دعاے صحت کی التجا کرو۔"

۴۔ قدوۃ الابرار شیخ برخوردار کی زبانی ایک روایت مجھے یاد ہے کہ فرماتے تھے......"

۵۔ میری شفیق اور مہربان والدہ فرماتی تھیں کہ......"

۶۔ "عبدالحکیم درودگر نے فقیر (چراغ بن شاہ مراد) سے بیان کیا کہ ایک روز میں حضرت شیخ (دولا) کے کنویں کی تعمیر میں مصروف تھا کہ......"

۷۔ عبدالعزیز بن فتح محمد مرحوم بیان کرتے ہیں کہ......"

د۔ دیگر ذرائع سے حاصل شدہ عام روایات:

۸۔ "کہتے ہیں کہ علم قدیم و جدید کے راز دان مولوی عبدالحکیم نور اللہ مرقدہٗ اکثر شیخ (دولا) کی زیارت کے لیے سیالکوٹ سے گجرات آتے تھے۔"

۹۔ "کہتے ہیں جب مولوی (عبدالحکیم) شیخ (دولا) کی خدمت میں آتے تو......"

۱۰۔ "کہتے ہیں جب سید جواد علاقہ گجرات کی فوجداری پر مامور ہوئے۔"

۱۱۔ "روایت ہے کہ ایک دن ایک آزاد منش آدمی نے آ کر شیخ (دولا) سے تازہ

انگور اور دو اشرفی نقد کی فرمائش کی۔"

۱۲۔ "کہتے ہیں کہ جب فتح چند نے کچھ مہینے راجہ گرب سنگھ کی سرکار میں بطور دیوان ماموریت حاصل کی۔"

۱۳۔ "کہتے ہیں اٹک میں میاں لال نام کا ایک نوجوان تھا۔"

۱۴۔ "روایت ہے کہ جب میر حسینی نام فوجدار گجرات نے بعض ناحق شناسوں کے اکسانے پر......"

ان بنیادی منابع کی مدد سے چراغ بن شاہ مراد قادری نے اپنے زیر نظر تذکرے کا تار و پود تیار کیا ہے، لیکن مصنّف نے کوشش کی ہے کہ صرف ان روایات و واقعات کو قبول کیا جائے جو فطری صداقت اور قابلِ قبول سچائیوں پر مبنی ہوں۔ ان کے راویوں میں خود حضرت شاہ دولا کی ذات با برکات کے علاوہ مصنّف کی والدہ ماجدہ، اپنے وقت کے شہرہ آفاق عالم ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی، زبدۃ الابرار شیخ برخوردار اور حضرت شاہ دولا کے متعدد اہل مجلس شامل ہیں۔ اس سے ان کی تصنیف کے ثقہ اور مستند ہونے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

چراغ بن شاہ مراد قادری سوانح نگاری میں اپنا ایک منفرد اسلوب رکھتے تھے۔ ان کے دور میں بزرگان دین کے متعدد تذکرے لکھے گئے لیکن چراغ بن شاہ مراد کا تذکرہ فنی اعتبار سے ان سب سے الگ لب ولہجہ رکھتا ہے۔ اس دور میں کسی ولی اللہ کی سوانح لکھتے ہوئے عموماً ان کی روحانی، مکاشفاتی اور مافوق الفطرت حیثیت کو مرکزِ توجہ قرار دیا جاتا تھا اور یوں اس دور کے تذکروں میں منطقی اور فکری رویوں پر کشف و کرامات کی فضا غالب ہے۔ اس دور کے درویش اور اہل اللہ بعض اوقات اپنے

معاشرے کی عمومی اور اجتماعی زندگی سے ذرا ہٹے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ سوانح نگاروں کے اسی اسلوب نے غالباً صاحبان ولایت کے بارے میں یہ تاثر پیدا کیا کہ وہ صومعہ نشین ہوتے ہیں اور علائق دنیاوی سے ان کا تعلق نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ رہبانیت کا یہ تصوّر نہ تو اسلامی تصوّف میں کسی جگہ بھی نظر آتا ہے اور نہ ہی اُصحاب روحانیت کے اقوال وافعال میں اس کی کوئی صورت دکھائی دیتی ہے۔ مسلمان صوفیہ اور بالخصوص برصغیر کے مسلمان صوفیہ اور اہل طریقت نے اپنی زندگیوں میں جس اصول حیات کو اپنایا اس میں ''بے ہمہ'' نہیں ''باہمہ'' کا فلسفہ واضح طور پر نظر آتا ہے۔ انھوں نے عام انسانوں میں رہ کر، عام انسانوں کی زندگی کو جہد وعمل کے ساتھ الوہی منازل اور مقامات سے ہمکنار کیا۔ حضرت شاہ دولا کی ذات انھی مقربان خدا میں سے ایک تھی جن کی سوانحی تفصیلات میں چراغ بن شاہ مراد نے ایک مافوق الفطرت نہیں، بلکہ ایک مثالی کردار کے خدوخال کو اُجاگر کیا ہے۔ ایسی صورت حال میں آیئے چراغ بن شاہ مراد کے بنائے ہوئے خاکے میں حضرت شاہ دولاؒ کی شخصیت کو دیکھتے ہیں۔ مصنّف کی فارسی عبارت کا قارئین کی سہولت کے لیے اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

لباس

''آپ کرپاس کی چادر لنگی کے طور پر، ایک سیدھا چولا اور خرقہ پہنتے تھے۔ سر پر کبھی پگڑی کبھی ٹوپی اور کبھی نمدے کی سرخ ٹوپی پر صافہ باندھتے تھے۔ پاؤں میں کشمیری جوتا اور کبھی چمڑے کا دیسی جوتا پہنا جاتا تھا۔ ہمیشہ زمین پر بیٹھ کر مجلس فرماتے اور کبھی دری اور گھاس بھی نہ بچھاتے۔ قالین اور نمدے کے فرش کا تو سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا تھا۔"

سادگی اور استغنا

"شیخ دولاؒ نے اپنی زبان سے کسی کو اپنے احترام یا اپنی تعظیم کے لیے ارشاد نہیں فرمایا۔ بلکہ اکثر اس سے منع کیا، لیکن اس کے باوجود عوام الناس بے اختیار ان پر فدا ہوتے تھے۔ یہ انبوہ کبھی کم نہیں ہوتا تھا اور لوگ آداب اور نیاز مندی میں ایک دوسرے سے سبقت لینا چاہتے تھے۔"

"جو تحائف اور نذر و نیاز جمع ہوتی تھیں حاضرین میں بانٹ دی جاتی تھیں اور میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ شیخ (دولا) نے کسی نفیس چیز یا قیمتی سامان کو اپنے پاس رکھنے کی خواہش کی ہو۔ سبحان اللہ! ترک و تجرید میں وہ مقام حاصل تھا کہ کبھی کسی چیز کی طرف راغب نہیں ہوتے تھے اور کبھی نہیں دیکھا کہ آپ نے عمدہ کھانے، پر تکلف لباس یا خوبصورت قالین پر بیٹھنے کی خواہش کی ہو۔ کوئی شخص ان کے خوان کرم سے محروم نہیں جاتا تھا۔ غرباء اور مساکین کی پرورش کے لیے تین مقامات پر لنگر جاری تھا اور تینوں جگہ دس دس من کے قریب کھانا تیار ہوتا تھا۔ ایک سیالکوٹ میں، دوسرے گجرات میں اور تیسرے نالہ ڈیک کے پل پر"۔

تسخیر قلوب، تالیف قلوب، کشف القلوب

"(شیخ) دولاؒ کو تسخیر قلوب اور دلوں کو اپنی طرف مائل کرنے پر اس قدر قدرت حاصل تھی کہ ہر اعلیٰ و ادنیٰ یہی سمجھتا تھا کہ ان کی جو عنایت مجھ پر ہے کسی اور پر نہیں۔ خاکساری اور کسر نفسی میں اپنے آپ کو اس حد تک لے گئے تھے کہ ہر شخص کو اپنے سے افضل سمجھتے تھے۔"

حلیہ مبارک

''آپ کے چہرۂ مبارک کا رنگ گندمی، پیشانی کشادہ، ابرو گھنے، آنکھیں کالی جن میں سرخ ڈورے دکھائی دیتے تھے اور بائیں آنکھ کے نیچے ایک انگلی کے فاصلے پر رخسار مبارک پر کالا تل تھا۔ قد درمیانہ، نہ لمبا، نہ چھوٹا۔ جسم بھی درمیانہ، نہ فربہ اور نہ لاغر۔ دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے ساتھ کی انگلی نہیں تھی۔ دونوں ہاتھ عام انسانوں کی نسبت بہت کھلے اور بڑے تھے۔ ریش مبارک بہت گھنی اور لمبی تھی۔ اکثر سر جھکا کر بیٹھتے تھے اور گفتگو کے دوران آواز اونچی اور پاٹ دار نکلتی تھی۔''

مجذوبوں اور بے حال لوگوں سے محبت

''مجذوب اور بے سدھ لوگ جنھیں کھانے پینے کی ہوش نہیں ہوتی تھی آپ کے آس پاس بیٹھے رہتے تھے اور شیخ (دولاؒ) اس فرقے سے بے حد اخلاص رکھتے تھے۔ انھیں اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتے تھے اور اگر کبھی کوئی گستاخی سے بھی پیش آتا تو درگذر اور برداشت فرماتے تھے۔''

آداب و رسوم کی پابندی

''شاہجہان بادشاہ کی بیٹی نے جب پل کے لیے حضرت شاہ دولاؒ کی خدمت میں اخراجات کی رقم ارسال کی تو واپس کرتے ہوئے فرمایا:...... کہ بھائیو! ہم اہل ہند ہیں اور ہمارے رسوم و رواج میں باپ کا بیٹی سے مال وصول کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔''

تعلیم و تدریس سے دلچسپی

''......اور معمول تھا کہ جمعہ کے دن شہر کے تمام (طالب علم) بچے شیخ (دولا)

کی خانقاہ میں حاضر ہوتے تھے اور فارسی غزلیات، گیت، مسدس اور اردو شاعری پڑھتے اور مختلف کھیل کھیلا کرتے تھے اور شیخ (دولاؒ) بے حد خوش ہو کر مٹھائی اور نقد انعامات انھیں مرحمت فرماتے تھے اور ان کے اساتذہ کے لیے بھی تحائف ارسال کیے جاتے تھے۔"

"......اسی طرح اتوار کے دن تمام طالب علم لڑکیاں آتی تھیں اور انعامات سے سرفراز ہوتی تھیں۔"

غذا کا مقصد

"(شیخ دولاؒ فرماتے تھے) کوئی شخص غذا اس لیے نہیں کھاتا کہ اس سے لذت طعام حاصل ہو، بلکہ کھانا صرف ضرورت کے وقت اس لیے کھانا چاہیے کہ عبادت الٰہی کے لیے قوت ملے۔"

استراحت کا مقصد

"(فرماتے تھے) اگر کوئی سوئے تو اس کا مقصد آسائش نہیں ہونا چاہیے بلکہ یہ کہ عبادت الٰہی کے لیے بدن میں طاقت کی تجدید ہو۔"

ارشادات حضرت شاہ دولا:

۱۔ یادِ الٰہی کا لبّ لباب یہ ہے کہ دل کو حبّ دنیا سے الگ رکھا جائے۔

۲۔ اگر عاجزی اور انکسار کے مقام تک پہنچنا ہے تو مفلوک الحال لوگوں کے پاؤں کی خاک بن جاؤ۔

۳۔ زہد و اطاعت اپنے آپ سے رہائی حاصل کر لینے کا نام ہے اور عالم سرخوشی میں

اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے دل نہ لگانے کو کہتے ہیں۔

۴۔ موت کو ہر وقت موجود سمجھو کہ حق تعالیٰ کی یاد کا خلاصہ موت کو یاد رکھنا ہے۔

۵۔ استغنا، غنی مطلق یعنی ذات باری تعالیٰ کی صفت ہے اور بندہ جس کی تخلیق صرف بندگی کے لیے اگر استغنا کا مدعی ہوتا ہے تو یہ اس کی طرف سے غرور ونخوت، خودنمائی، تکبر اور خود پرستی کا اظہار ہے۔

۶۔ میری جان! آئین درویش، خاک نشینی اور خود بینی سے دوری ہے نہ کہ گوشہ نشین ہو کر دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھنا اور دوسروں میں عیب تلاش کرنا۔



مآخذ

1۔ احمد حسین قریشی قلعداری: تذکرۂ اولیاے گجرات، جواد برادرس اردو بازار، لاہور، ۱۹۷۱ء

2۔ ایضاً: حضرت شاہ دولہ دریائی اوران کا خاندان، (قلمی)، مملوکہ مصنف، گجرات

3۔ ایضاً: ضلع گجرات، پنجابی ادبی بورڈ، لاہور، ۱۹۹۵ء

4۔ ایضاً: گجرات بعہد قدیم وجدید، مکتبۂ ظفر، محلہ فیض آباد، گجرات، ۱۹۶۸ء

5۔ ایم زمان کھوکھر: گجرات تاریخ کے آئینے میں، یاسر اکیڈمی کچہری روڈ، گجرات، ۱۹۹۸ء

6۔ ایضاً: گجرات تصاویر کے آئینے میں، یاسر اکیڈمی کچہری روڈ، گجرات، ۱۹۹۵ء

7۔ چراغ بن شاہ مراد: سوانح حضرت شاہ دولا، قلمی، کتابخانہ گنج بخش اسلام آباد [نمبر 2678]، کاتب میاں محسن علی، تاریخ کتابت ۲۶ کاتک سمت ۱۸۹۴ مطابق ۸ نومبر ۱۸۳۷ء

8۔ دنی چند، رائے: کیگو ہرنامہ، مرتبہ ڈاکٹر محمد باقر، پنجابی ادبی اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۵ء

9۔ شریف کنجاہی: حضرت شاہ دولہ گجراتی، مرکز معارف اولیا محکمہ اوقاف، لاہور، ۱۹۸۵ء

10۔ غلام سرور لاہوری: مفتی: حدیقۃ الاولیاء، نولکشور، لکھنؤ، ۱۸۹۰ء

11۔ ایضاً: خزینۃ الاصفیاء، مطبع نولکشور، لکھنؤ، ۱۸۷۶ء

12۔ محمد اعظم بیگ: تاریخ گجرات، مطبوعہ وکٹوریہ پریس، لاہور، ۱۸۷۰ء

13۔ محمد منیر سلیچ: خفتگان خاک گجرات، سلیچ پبلی کیشنز، گجرات، ۱۹۹۶ء

14- Pir Nasiruddaula: *The Story of Hazrat Shah Daulah*, Ghazia Publishers, Gujrat, 2003



(ڈاکٹر گوہر نوشاہی صاحب کا یہ مضمون، رسالہ دریافت ،اسلام آباد، شمارہ ۷، سال ۲۰۰۸ء سے لیا گیا ہے۔ دریافت کے مطبوعہ مضمون میں کتابت کی غلطیوں کو یہاں درست کر دیا گیا ہے۔ گوہر صاحب نے دریافت میں مطبوعہ مضمون میں کہیں ''دولہ'' اور کہیں ''دولا'' املاء اختیار کیا ہے، یہاں یکسانیت کے لیے ہر جگہ ''دولا'' میں تبدیل کیا گیا ہے۔ عارف نوشاہی)

تذکرۂ شیخ دولا گجراتی

(اردو ترجمہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بے حد حمد وثنا، اس ذاتِ باری کے لیے جو زمین و آسمان کے چودہ طبقات کا خالق، عرش و لامکان کو پیدا کرنے والا اور ماہ و خورشید تاباں کو سجانے والا ہے۔ جس نے اپنی تمام تر مشیتِ شاملہ اور قدرتِ کاملہ سے تمام آفرینش عالم میں سے ابنِ آدم کی تخلیق کو بارگاہ ربوبیت میں ایک خاص مقام عنایت فرمایا، انوار حقایق، معارف مجیب، تجلیات جمال اور وصال لاریب کو اپنے خاص بندوں کے دلوں پر وا فرمایا، اور ہر کسی کو اس کی وسعت ظرف، صلاحیت اور جوہر قابلیت کے لحاظ سے مختلف درجات سے نوازا۔ ایک قوم کے لیے علم الیقین، شادمانی کا باعث بنا۔ کوئی گروہ عین الیقین کے سبب مسرور ہوا اور ایک جماعت حق الیقین کی بدولت فرحان ہوئی، لیکن یہ تینوں درجات ایک ساتھ میسر نہیں آتے۔ اگر دین متین اور سرور انبیاء، خلاصۂ اصفیاء کی ملت مبین کی پیروی نہ کی جائے کہ **یا نور نوری و یا سرّ سرّی افدیت ملکی علیک یا محمّد کلھم یطلبون رضای و انا اطلب رضاک یا محمّد و اصحابہ و علی کلّ تابعین و سلم** [اے میرے نور کے نور، اے میرے راز کے راز، میں نے اپنا ملک تجھ پر قربان کر دیا، یا محمد، تمام میری رضا طلب کرتے ہیں اور میں اے محمد آپ کی اور اصحاب کی تمام تابعین کی رضا طلب کرتا ہوں۔] ان کی شان ہے **صلی اللہ علیہ و علی آلہ و اصحابہ و علی کل تابعین و سلّم۔**

اس متابعت کا تعلق چار حالتوں سے ہے:

اوّل، افعال محمدی سے، کہ مکمل طور پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر اختیار کیا جائے اور شرعی احکامات میں بلا عذر از خود تفاوت و تجاوز روا نہ رکھا جائے اور خلفاے راشدین کی افضلیت پر اعتقاد خلافت کی ترتیب کے مطابق ہو اور اہل سنت و جماعت اور سواد اعظم کے مذہب پر عقیدہ رکھے۔ توبہ و اطاعت پر قائم اور ثابت قدم ہو۔ پس اسی کو مقام شریعت کہتے ہیں۔

دوم، متابعت خصائل محمدی، یہ ہے کہ باطنی خو اور خصلت کو اخلاق ذمیمہ سے صاف کر کے اچھے خصائل سے سنوارے اور "تخلقوا باخلاق اللہ" کی سیرت اپنی ذات میں پیدا کرے۔

اس لیے کہ نفس امّارہ شیطانی صفت رکھتا ہے، جب اس سے آگے گذرا تو درندہ صفات کو جا پہنچا، جسے نفس لوامہ کہتے ہیں۔ جب اس مرحلے کو طے کر لیا تو حیوانی منزل تک پہنچا، جسے نفس ملہمہ کہتے ہیں، اور جب اس سے قدم آگے بڑھا تو فرشتوں کے ہم وصف ہو گئے، اسے نفس مطمئنہ کہتے ہیں۔ پس اسی کا نام ''مقام طریقت'' ہے۔

تیسرا، متابعت احوال محمدی، یہ ہے کہ اپنے صحن سینہ کو نفسانی وسوسوں کے غبار اور شیطانی حرص و ہوس کی آلودگی کو نفی ماسوئی اللہ اور اثبات ھواللہ کے جھاڑو سے پاک کر کے تصفیہ قلب اور تزکیہ روح حاصل کیا جائے اور حضور کی لذت حاصل کرے تا کہ آئینۂ دل میں عالم قدس کے باغات کی جلوہ نمائی اور جلوہ سرائی ہو۔ یہی وہ مقام ہے جس کے بارے میں مولانا روم قدس سرہ فرماتے ہیں:

آن خیالاتی کہ دامِ اولیاست
عکسِ مہ رویانِ بُستانِ خداست

اسی مقام سے انسان پریشانی طبع سے نکل کر، جمعیت فطری میں مقیم ہو جاتا ہے اور اس پر باطن کی آنکھ سے انوار حقیقی کا انکشاف ہوتا ہے۔ لہٰذا اسے ''مقام حقیقت'' کا نام دیا گیا ہے۔

چوتھی حالت متابعت وصال محمدی ہے، اگرچہ اس ارفع درجے تک پہنچنے کے لیے پہلی تینوں حالتیں زینے کا درجہ رکھتی ہیں اور جب تک یہ تین مقامات طے نہ ہو جائیں سالک کو وہ درجہ نہیں مل سکتا اور جب وہاں پہنچ جائے تو کسب انسانی اور جہادِ نفسانی کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور دوئی کا پردہ درمیان سے اٹھ جاتا ہے۔ محب، محبوب کو اپنا آئینہ سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو اس کا آئینہ، کبھی وہ اسے اپنی طرح دکھائی دیتا ہے اور کبھی وہ مولیٰ اور یہ۔۔۔ (کذا: اصل فارسی عبارت: گاہ او مولی واین بگیرد) جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے۔

من با تو چنانم ای نگار چینی [یمنی]
کاندر غلطم کہ من تو ام، یا تو منی

توفیق کی دستگیری، ہادی مطلق، اور عون عنایت رہنمائی برحق سے سالک کو وصال کے ہر قریب ترین مرتبے تک پہنچا سکتی ہے۔ چنانچہ غوث، قطب، ابدال، اوتاد، نقبا، نجبا، ابرار و اخیار کے مختلف مناصب اور درجات اسی مقام سے عطا ہوتے ہیں۔ اور اولیاے کامل کو کشف

قلوب، کشف قبور، کرامات، طیِّ زمان و مکان، ہدایت نظر اور کونی و الٰہی حقایق کا ادراک بھی یہیں سے ہوتا ہے۔ اس کو "مقامِ معرفت" کہتے ہیں۔ ان مقامات کی تشریح دوسرے لوگوں نے بیان کی ہے یہاں گفتگو کی مناسبت سے اسی مختصر بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

باعث تصنیف:

اس رسالہ کا محرّر اور اس دستاویز کا مؤلف، بندۂ ناچیز، فقیر، چراغ بن شاہ مراد قادری، صاحب دل و پاک صوفیہ کی بارگاہ میں ہدایت و رہنمائی کا متمنی ہے کہ ابتدائے آفرینش سے روز قیامت تک یہ زمان و مکان، مردان خدا اور رہروانِ شیدا سے خالی نہیں ہے۔

از کران تا بہ کران لشکر ظلم است و لیک
از ازل تا بہ ابد فرصت درویشان است

اس عظیم جماعت کا بابرکت وجود ہمیشہ مستعد اور جلوہ گری کے لیے تیار رہتا ہے۔ بلکہ زمین و زمان کا استحکام اور اس عالم اور اہل عالم کا انتظام انھی پاک ہستیوں کے قوام سے ہے۔ جب کبھی یہ جماعت پردۂ اخفا میں چلی گئی تو اس دنیا کے استحکام کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

مبین حقیر گدایان عشق را کاین قوم
شہان بی کمر و خسروان بی کُلہ اند

اکثر نافہم اور باطنی بصیرت سے عاری لوگوں نے اپنے بے بنیاد قیاسات کی بناء پر یہ سمجھ رکھا ہے کہ ماضی میں ایسے بلند مرتبت لوگ تو گزرے ہیں، لیکن اس زمانے میں ویسا کوئی فرد موجود نہیں ہے جس سے عقیدت مندی اختیار کی جائے اور رہنمائی کی سعادت حاصل کی جاسکے۔ ان لوگوں کا یہ جواز محض ان کی نادانی اور گوہر مقصود تک ان کی نارسائی کا پتا دیتا ہے۔ شاید وہ لوگ اس وہم میں مبتلا ہوں کہ جو کچھ ان لوگوں کو نصیب ہوا، ہوسکتا ہے کہ تمام عالم کو نہ ہو۔

گر بہ صورت آدمی انسان بُدی
احمد و بوجہل ہم یکسان شدی
کارِ پاکان بر قیاس از خود مگیر
گرچہ باشد در نوشتن شیر، شیر

اسی بناء پر غیبی واردات اور لاریبی طہارت سے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اپنے

زمانے کے عارفوں کے حال واحوال اور افعال واقوال میں سے بعض واقعات جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپنے کانوں سے سُنے، احاطۂ تحریر میں لے آؤں تاکہ بعد میں آنے والوں کے لیے کوئی قابل قدر کام چھوڑ جاؤں۔ لیکن جب میں نے مکمل غور وفکر کے ساتھ اپنا جائزہ لیا تو خود کو قاصر پایا۔ مہلت وقت بھی کم نظر آئی۔ ناچار، مشتے نمونہ از خروارے اور تضاعف یک یک شمار ہزارے، کے مصداق، مقربِ مولا، شیخ دولا قدس سرہ العزیز کے حالات زندگی میں سے چند واقعات کا انتخاب کیا اور تبرک کے طور پر انہیں قلم بند کیا۔

آنحضرت کے احوال ومقامات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کی عمر گرامی کے کسی ایک حصے کے بارے میں لکھا جاسکتا ہے لیکن میں نے دریا سے ایک قطرہ، بوے صبا سے ایک جھونکا اور خُم صہبا سے ایک گھونٹ کا انتخاب کیا ہے تاکہ اس کے وسیلے سے اہل اللہ کے دامن سے محروم نہ رہوں۔

اس رسالے کے سادہ طرز تحریر اور روانی مضمون کی وجہ یہ ہے کہ روشن ضمیر انشا نویس کو فصاحت تقریر اور بلاغت تحریر کے لیے کذب وتزویر کا تکلف کرنا ناگزیر ہوتا ہے، لیکن یہاں چونکہ راست بازوں کی باتیں بیان کرنا ہیں، اس لیے سچائی کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔

راست روی کن کہ شوی رستگار
راستی از تو، ظفر از کردگار

اسی بناء پر میں نے بغیر کسی مبالغہ، بلاغت اور تصنع کے فارسی میں یہ باتیں سپرد قلم کی ہیں تاکہ فہم آسان ہو اور دروغ گوئی کا شائبہ تک نہ ہو۔

حضرت عرفان پناہ شیخ دولا کے مبداء ومنشاء کا بیان:

فقر ودرویشی کا دریاے مواج، آزادہ روی اور بے خودی کا متلاطم سمندر، سالک مجذوب، عاشقِ محبوب، متکاثر المقامات، متواتر الکمالات، خاکسار خاک نشین، عالی مقدار والا تمکین، کاشفِ سرایر جلیہ، واقفِ امایر عینیہ، معرفت الٰہی کے رمز شناس، ناسکِ مناسک سنیہ، مبدع الحقایق، مرجع الخلائق، قبلہ ارباب فیض وعطا، کعبۂ اصحاب جود وسخا، مسجودِ مقبلان جہان معنی، مقربِ حضرت مولا، شیخ دولا قدس سرہ العزیز سے ایک روز عزت خان ولد سلطان شادمان گکھڑ نے درخواست کی کہ یا حضرت اپنے ابتدائی حالات سے ہمیں آگاہ فرمایئے۔ حضرت نے اس لطف وکرم کے باعث، جو وہ ان پر روا رکھتے تھے، ان کی درخواست کو شرف قبولیت بخشتے

ہوئے زبان الہام وا کی اور فرمایا:

میری والدہ ماجدہ کا نام نعمت خاتون اور والد کا نام عبدالرحیم لودھی افغان ہے۔ جن کا تعلق سلطان سکندر لودھی کے قبیلے سے تھا۔ اس قصہ کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ سلطان سلیم ولد شیر شاہ سوری کے عہد حکومت میں ہمایوں بادشاہ سے وفاداری اور پاس نمک رکھنے پر سلطان سارنگ گکھڑ پر لشکر کشی کی گئی۔ بڑے پیمانے پر جدال وقتال کے بعد سلطان سارنگ شہید ہو گئے اور ان کے اہل خانہ اور قبیلہ کی تمام عورتیں اور بچے افغانوں کے ہاتھوں تباہی اور لوٹ مار کا شکار ہوئے۔

غازی خان بن سلطان سارنگ کی بیٹی، جو کہ نعمت خاتون کی والدہ تھیں، افغانوں کی قید میں چلی گئیں۔ نعمت خاتون اس حادثے کے وقت ماں کا دودھ پیتی تھیں۔ جب سلطان سلیم کا عہد سلطنت رو بہ زوال ہوا تو ہمایوں بادشاہ ایک سال تک برسر اقتدار رہا اور اس جہان فانی کو خیر آباد کہہ گیا اور بادشاہی اکبر کو مل گئی۔ نعمت خاتون سن بلوغ کو پہنچ چکی تھیں۔ عبدالرحیم نامی ایک افغان نے، جو کہ بادشاہ کے معتمد خدمت گار اور قابل سپاہی تھے، نعمت خاتون کو اپنے نکاح میں لے لیا اور اکبر بادشاہ کی تخت نشینی کے پچیسویں سال [=۹۸۷ھ] شیخ دولا کی ولادت ہوئی اور اسی سال ان کے والد عبدالرحیم نے اس جہان فانی سے عالم جاودانی کے لیے رخت سفر باندھا۔

چونکہ نعمت خاتون نے اپنی والدہ کی زبانی سنا تھا کہ ان کا وطن پوٹھوہار ہے، لہٰذا یہ بے کس و لاچار بیوہ ہندوستان سے ہجرت کر کے پوٹھوہار آ گئی۔ وہاں چونکہ سلطان سارنگ کے واقعہ کو ایک مدت گزر چکی تھی، لہذا کسی نے انہیں نہیں پہچانا اور احوال پرسی نہیں کی۔ وہ پانچ برس تک موضع سہالہ (پرگنہ دانگلی پھروالا) میں محنت مزدوری کر کے گذر اوقات کرتی رہیں۔ پھر موضع کالہ، پرگنہ روہتاس اُٹھ آئیں اور چار سال تک چکّی کی مشقت سے گذر بسر کی اور اسی مقام پر جان، جان آفرین کے سپرد کی۔

شیخ طفلِ یتیم و مسکین الیم، بے وطنی کے دشت میں سرگردان، فقیری اور گدائی کی حالت میں قصبہ سنخی سیال کوٹ جا پہنچے۔ وہاں مٹھہ گھمان نامی، اولاد سے محروم ایک باثروت، بامروت اور بلند ہمت شخص نے، جو کہ پٹواریوں کے ملازم تھے، شیخ کی عادات واطوار کو پسند کرتے ہوئے اور ان کی یتیمی اور بے کسی پر رحم کھا کر انہیں اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا اور نہایت ناز ونعمت اور بھرپور توجہ سے ان کی پرورش اور تربیت کی۔ یہاں تک کہ شیخ جوان ہو گئے۔ بزرگی کے آثار ان کی پیشانی

سے صاف عیاں تھے۔

پٹواریوں نے ان میں دانش مندی کے آثار اور کام کرنے کی صلاحیت دیکھتے ہوئے انہیں گھمان سے لے لیا اور اپنے توشہ خانہ کی ذمہ داری انہیں تفویض کردی۔ شیخ اس وقت بھی اس قدر سخی اور باہمت تھے کہ کبھی کسی دستِ سوال دراز کرنے والے کو خالی نہیں لوٹایا۔ جو کچھ بھی ان کے پاس ہوتا، خدا کی راہ میں خرچ کر دیتے تھے۔ ضرب المثل مشہور ہے کہ سخی کے ہاتھ میں مال اور چھلنی میں پانی نہیں ٹکتا، شیخ کا بھی یہی حال ہوا اور چند ہی دنوں میں توشہ خانے کا تمام مال و اسباب محتاجوں میں تقسیم کر دیا۔ پٹواریوں کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو شیخ کو قید، کوڑوں اور مختلف قسم کی سزاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ شیخ جب یہ سہتے سہتے تھک گئے اور جان گئے کہ اب موت کے سوا چارہ نہیں تو انھوں نے پٹواریوں سے کہا کہ اگرچہ توشہ خانے کا غلہ میں نے خرچ کر دیا ہے لیکن تمام نقدی اسی توشہ خانہ میں دفن ہے۔ اگر میرے ہاتھ پاؤں کھول کر مجھے اس جگہ لے جایا جائے تو میں وہ تمام نقدی نکال کر دے دوں گا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ شیخ جونہی اندر گئے، طاق سے خنجر اٹھایا اور اپنے پیٹ میں گھونپ لیا۔ نیتجتاً کھال اور پیٹ کا پردہ پھٹ گیا اور آنتیں باہر آ گئیں، لیکن خدا کی قدرت سے آنتوں کو اس زخم سے کوئی گزند نہ پہنچی۔ پٹواری اس واقعے کو اپنے ہاتھوں سرزد ہوا گناہ عظیم اور قابل دست اندازی قانون جرم گردانتے ہوئے علاج کے لیے کوشاں ہوئے اور ماہر طبیب کی خدمات حاصل کیں۔ جس نے آنتوں کو پیٹ میں واپس ڈالا اور زخم کے سوراخ کو سکّے سے بند کر کے اوپر کی جلد اور پردے کو سوئی اور موٹے دھاگے کی مدد سے سی کر مرہم لگا دیا۔ تین ماہ کے بعد شیخ کا یہ زخم مندمل ہوا اور آپ صحت یاب ہوئے۔ پٹواریوں نے ان کی شفا یابی کے بعد انہیں آزاد کر دیا۔

چونکہ شیخ کی حصول سعادت کی گھڑی قریب آ پہنچی تھی لہٰذا آپ والہ معرفت الٰہی، مدہوش ساغر عشق نامتناہی، محو دریائے وحدت، واصل شہود حقیقت کی قدم بوسی اور ان کے دست مبارک پر بیعت سے مشرف ہوئے اور وجود پیوستہ بہ موجود، محرم خلوت سرائے عرفان وصفا، سالکِ مسالکِ ناپیدا، عارفِ معارف نہان و ہویدا، مخمور الست، شاہ شیدا سرمست، جن کی خانقاہ سخی سیال کوٹ کے جوار میں قصبہ پھکونی پورہ میں تھی، کے پاس گئے۔ شاہ شیدا کی حالت یہ تھی کہ بحر توحید میں غایت استغراق سے عالم جذب وتفرید کو پہنچ چکے تھے اور فنافی اللہ اور بقاباللہ کا مقام رکھتے تھے۔

اگر کبھی ان کی زبان مبارک سے برا بھلا کوئی لفظ نکل جاتا تو بغیر کسی تاخیر کے، اسی لمحے اس کا اثر ہو جاتا۔ سچ ہے:

زبان ہای مردانش تیغ قضا ست

نگاہ گدایان تیر خداست

نقل ہے کہ ایک پچاس سالہ برہمنی عورت بانجھ تھی۔ حصول اولاد کی خواہش دل میں لیے ایک سال تک شاہ شیدا کی خدمت میں آتی رہی اور ہمیشہ سبزی کا سالن اور روٹی بطور نذرانہ لاتی تھی۔ چونکہ ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ اس کی امید کی جھولی مراد سے بھر جاتی، وہ مایوسی کا شکار ہو گئی اور آمد و رفت معطل کر دی۔ وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ کہتے ہیں:

مشو آزردہ دل گاہی زدست نا امیدی ہا

کہ صبحی است در پی آخر این شام غریبان را

ایک روز شاہ شیدا نے یاد فرمایا کہ فلاں عورت چند روز سے یہاں نہیں آ رہی۔ شاید وہ ہم سے آزردہ خاطر ہو گئی ہے۔ یہ کہہ کر بھاگتے ہوئے خانقاہ سے نکل کر شہر کا رخ کیا اور اس عورت کے گھر سے ملحقہ گلی کے کنارے بیٹھ گئے۔ ان کی زیارت کے لیے جم غفیر اکٹھا ہو گیا۔ مذکورہ عورت بھی حسب توفیق نیاز لے کر حاضر ہوئی۔ شاہ شیدا نے فرمایا۔ فلانی! تم کچھ عرصہ ہماری خدمت میں آتی رہی ہو۔ اب کیا امر مانع ہوا کہ تم نے یہ عمل ترک کر دیا؟ اس نے عرض کیا: یا حضرت! درویشوں کے حضور میری باریابی کا مقصد فقط حصول اولاد کے پیش نظر تھا، جب مجھے یہ علم ہو گیا کہ اس تمنا کی تکمیل میرے بخت میں روز ازل سے ہی درج نہیں، تو ہر روز بزرگان کی خدمت میں آ کر کیوں باعث تکلیف بنتی۔ [بقیہ واقعہ غیر اخلاقی ہونے کے باعث ترجمہ میں حذف کر دیا گیا ہے۔]

....

....

....

....

....

....

....

....

....

شاہ شیدا کی اس قسم کی کشف و کرامات متعدد ہیں۔ اگر وہ تمام واقعات جو مجھ فقیر کے علم میں ہیں، ضبط تحریر میں لاؤں تو اس کے لیے ایک الگ کتاب درکار ہوگی۔ چونکہ میرا مقصد حضرت شیخ دولا کے واقعات بیان کرنا ہے لہٰذا اگر اس ضمن میں بزرگان اور ان کے سلسلے کے واقعات بھی احاطۂ تحریر میں لائے جائیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن طوالت کے پیش نظر ایسا نہیں کیا جائے گا۔

شیخ دولا کا شاہ شیدا سے مشرف ہونے کا بیان:

سعادت اثر خبر کے منتظرین، عقیدت سیرت آرزومندوں اور مشتاق نظر لوگوں سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ جب شیخ دولا نے شاہ شیدا کے حضور شرف باریابی حاصل کیا تو اس سے کچھ عرصہ قبل منگو نام کا ایک شخص، شاہ کا نہایت معتمد اور خاص خادم تھا، بلکہ شاہ اس کے حکم کے تابع تھے۔ شیخ نے اپنی خداداد فراست کی بدولت یہ جانچ لیا کہ منگو کی رضا و منشا کے بغیر یہاں اپنی جگہ بنانا ناممکن ہے، ناچار اس کے ساتھ دوستانہ روابط و مراسم پیدا کیے اور دل و جان سے شاہ کی بندگی اور خدمت گذاری میں سرگرم ہوئے۔ ہمیشہ سیال کوٹ سے خیرات میں ملے ہوئے روٹی کے ٹکڑوں اور متفرق اشیاء سے کاسہ کو پُر کر کے لاتے اور شاہ کو پیش کرتے۔ شاہ اس میں سے بقدر اشتہا تناول کرتے۔ جب وہ جھوٹا چھوڑ دیتے تو اس کے بعد یہ کاسہ منگو کے سامنے لایا جاتا۔ وہ اپنا حصہ لے کر، ایک حصہ شیخ دولا کے لیے چھوڑ دیتا۔ یہی شیخ کی خوراک تھی، خواہ وہ سیر ہو جاتے، خواہ بھوکے رہتے۔ اکثر بھوکے ہی رہ جاتے اور آٹھ پہر اسی ناکافی غذا کے ساتھ شاہ کی خدمت میں کمربستہ رہتے۔

شیخ دولا۔ نوّر اللہ مرقدہ۔ سے نقل ہے کہ ایک دن شاہ شیدا نے مجھے غصہ سے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اے غلام تو ہر روز میرے لیے بھیک میں مانگے ہوئے لوگوں کے جھوٹے اور لعاب

زدہ لقمے لے کر آتا ہے۔ کراہت طبع کی وجہ سے اسے کھانے کو میرا دل نہیں چاہتا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اپنے ہاتھوں کی کمائی سے کوئی صاف ستھری، پاکیزہ چیز میرے لیے مہیا کرو، تاکہ میں اسے اپنی غذا بناؤں؟ میں نے اس صریح حکم کی تعمیل بجالاتے ہوئے پھاوڑا کاندھے پر رکھا اور شہر سیالکوٹ چلا گیا۔ اس زمانے میں وہاں زیر زمین ایک قدیم عمارت برآمد ہوئی تھی اور بادشاہ کے حکم کے مطابق وہاں سے اینٹیں نکال کر شہر میں ایک نئے قلعہ کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ میں بھی منتظمین کی اجازت سے اینٹیں نکالنے کے کام میں لگ گیا۔ مزدوروں کو اجرت دینے کا قاعدہ یہ تھا کہ جو کوئی اس قدیم عمارت کے طول و عرض سے ایک ہاتھ اینٹیں اکھاڑتا، اُسے اجرت میں ایک ُتنکہ ملتا۔ مذکورہ قدیم عمارت کی تعمیر چونے اور مٹی سے اس طرح کی گئی تھی کہ ایک چابک دست قوی مزدور دن میں دو یا زیادہ سے زیادہ تین ہاتھ کھود کر اینٹیں نکال سکتا تھا۔ میں نے خدا کی مدد سے اس عمارت کے طول سے ستر ہاتھ اور عرض سے ایک ہاتھ کھود کر کھود کر اینٹیں نکال لیں۔ جب شام کے وقت منتظمین نے مزدوروں کی اجرت کا حساب، زمین ناپ کر کیا تو میری مزدوری ستر ہاتھ کے حساب سے بنی۔ ٹھیکے دار، مستری اور خزانچی یہ تیز دستی دیکھ کر قدرت ایزدی پر حیران رہ گئے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ یہ کسی آدم زاد کا کام نہیں ہے۔ یہ شخص یا تو صاحب ولایت ہے یا جنات کی کوئی قوم اس کے تابع ہے۔ غرض، ٹھیکے دار نے ستر تنکے بطور اجرت اپنے ہاتھ پر رکھ کر مجھے پیش کیے۔ مجھے صرف چار تنکے درکار تھے، وہ لے لیے اور انھی کو خرچ کیا۔ بازار جا کر دو تنکوں کی کھچڑی، تین بہلولی کا تیل اور ایک بہلولی سے ایندھن خریدا اور پکا کر شاہ شیدا کے حضور لے گیا۔ شاہ نے جونہی مجھے دیکھا، زیر لب تبسم فرمایا اور محبت بھری گالی دیتے ہوئے فرمایا ''اے غلام تو نے یہ سمجھا ہوگا کہ آج میں نے کس قدر مشقت اور چابک دستی کا مظاہرہ کیا، لیکن تو نہیں جانتا کہ آج پورے دن کی اس محنت مزدوری میں شیدا بھی تیرے ساتھ شریک رہا ہے۔ آ میرے ہاتھ دیکھ کہ پھاوڑا چلا چلا کر کس قدر آبلے پڑ گئے ہیں۔ واقعی کیا دیکھتا ہوں کہ شاہ کے ہاتھ آبلوں سے بھرے پڑے ہیں۔ گویا پھول کی پتیوں پر شبنم پڑی ہو۔ جب کھچڑی کے چند لقمے چکھے تو فرمایا: ''آج کھانے کی حقیقی لذت ہے۔ ہاتھ کی کمائی کا لطف ہی اور ہے۔'' بعد ازاں بچا ہوا کھانا تبرک کے طور پر مجھے عنایت فرمایا۔ اس کا کھانا تھا کہ میرے سیدھے ہاتھ کی انگلی میں شدید درد اٹھا۔ تکلیف کی شدت نے میرے وجود کو اس قدر بے آرام کیا کہ دو دن اور رات سوائے آہ و فغان کے

میں اور کوئی کام نہ کر سکا، نہ سو سکا اور نہ ہی کچھ کھایا۔ منگو نے میرا اضطراب اور واویلا سن کر شاہ شیدا کے حضور سفارش کی کہ دولا ایک بہت اچھا خدمت گار ہے، کچھ تدبیر کرنی چاہیے کہ یہ درد سے نجات پالے۔ شاہ شیدا نے فرمایا "اے منگو تو نہیں جانتا کہ یہ غلام میری تمام دولت کا لٹیرا ہے، آج یا کل تو دیکھے گا کہ میری تمام متاع لوٹ کر لے گیا ہے۔ پس ایسے رند عیار کو قرار واقعی سزا ملنی چاہیے تاکہ اس کی آزمائش کی جاسکے کہ آیا یہ اپنے طریق پر قائم رہے گا یا خوف زدہ ہو کر بھاگ جائے گا۔" یہ کہہ کر روئے مبارک میری جانب کیا اور فرمایا کہ تیرے درد کا علاج محلہ قصاباں میں ہے وہاں جا اور کسی ذبح شدہ گائے کی آنتوں سے نکلی ہوئی تازہ آلائش کی حدت میں اپنا ہاتھ ڈال، تو شفا پائے گا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس آلائش کے اندر ہاتھ ڈالتے ہی آسودگی اور راحت کا احساس ہوا۔ مجھے مسلسل دو دن اور راتوں سے اس درد کی وجہ سے جگ رتا تھا۔ مجھے گہری نیند نے آلیا۔ ایک دن اور ایک رات اسی جگہ محو خواب رہا۔ جب بیدار ہوا اور اپنے ہاتھ آلائش سے باہر نکالے تو درد کا احساس تک باقی نہ تھا، لیکن میری وہ انگلی درمیانی پور تک ہاتھ سے علیحدہ ہو چکی تھی۔ جب شاہ شیدا کی خدمت میں حاضر ہوا تو نہایت لطف و محبت سے میری جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا "اے غلام! تیرے وجود میں فقط اتنی ہی نفسانیت تھی جو اب دور ہو چکی ہے۔ اب کدورتِ غیر نکل گئی اور مایۂ عبودیت باقی بچا ہے۔ خاطر جمع رکھ کہ تو ہماری عنایات کے قابل اور معرفت حق کا حقدار قرار پایا ہے۔" میں ان کے حضور تشکر آمیز آداب بجالایا اور ہر روز ان کی تازہ بہ تازہ مہربانیاں اپنے شاملِ حال ہوتے دیکھتا، لیکن شاہ کے ولی عہد اور نائب کی حیثیت سے منگو کی رضامندی اور خوشنودی کو تمام امور پر مقدم رکھتا تھا۔ اسی طور سے بارہ برس تک گہری عقیدت و دل بستگی سے ان کی خدمت کی سعادت حاصل کرتا رہا۔

بعد ازاں شاہ شیدا، اسہال کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ اس میں روز بروز شدت آتی گئی، جس قدر آلائش ان کے شکم شریف سے باہر نکلتی، میں اپنے دونوں ہاتھوں سے سمیٹتا اور باہر پھینک آتا اور اسی وقت بیابان سے صاف مٹی اور خشک ریت لا کر اس جگہ پر پھیلا دیتا تھا۔ منگو اور اس کا بیٹا، جو ہمہ وقت عمدہ اور نفیس ملبوسات میں ملبوس رہتے تھے اور عطریات کی خوشبو سے خود کو مہکائے رکھتے تھے، ناگوار بو کے سبب حجرے میں نہیں آتے تھے اور دروازے پر کھڑے کھڑے ہی شاہ کی احوال پرسی کر لیا کرتے تھے۔

ایک دن منگو نے کہا کہ اے دولا! آج میں دیکھ رہا ہوں کہ شاہ شیدا کو سخت تکلیف نے گھیر لیا ہے۔ تو ان کے پاس رہ کر ان کا خیال رکھ اور میں قصبہ جموں جا کر کسی طبیب کو لے آتا ہوں، شاید وہ کچھ علاج کر سکے۔ میں نے کہا بہتر۔ وہ سوار ہو کر جموں کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسی رات شاہ کا آخری وقت آن پہنچا۔ ایک پہر گذرا تھا کہ با آواز بلند بولے: تُو کون ہے؟ میں نے کہا بندہ دولا ہے۔ یہ سن کر خاموش ہو رہے۔ چند لمحوں کے بعد پھر پوچھا تُو کون ہے؟ میں نے کہا بندہ دولا ہے، پھر خاموش ہو گئے۔ جب کچھ وقت اور گذرا تو تمام تر جذب و جلال کے ساتھ گرج دار آواز میں اس طرح پکارے گویا کوئی شیر نر شکار پر دھاڑ رہا ہو۔ میرا سارا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا اور لرزہ طاری ہو گیا۔ اس کے بعد پوچھا تو کون ہے میں نے کہا بندہ دولا! فرمایا منگو کہاں گیا؟ میں نے عرض کیا کہ طبیب لانے کی غرض سے جموں کی طرف گیا ہے۔ فرمایا! وائے نصیب، آ اے دولا ''جسے دسے تسے مولا''۔ جب میں ان کے قریب گیا تو وصیت فرمائی کہ میری اس گڈری کو سنبھال کر رکھنا کہ یہ زندگی میں تیری پردہ پوشی کرے گی اور میرے اس الاؤ کی آگ ہمیشہ جلائے رکھنا کہ اس کی برکت سے تیری فقر و درویشی کی آب و تاب قائم و دائم رہے گی۔ آ اپنا منہ میرے منہ پر رکھ۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ انہوں نے تین مرتبہ اللہ اللہ کہا اور اپنے منہ سے مجھ پر دم کیا، خود ایک سانس لیا اور جان، جان آفرین کے سپرد کر دی۔

قطعہ

تا ہوا رنگِ آفتاب گرفت
رَخت برداشت از میانہ ظلام
منجذب گشت قطرہ در دریا
ماند دریای، قطرہ شد گمنام

شاہ شیدا وہاں اپنی جان سے گئے اور میں یہاں بے خود ہو گیا۔ اسی بے ہوشی کے عالم میں کیا دیکھتا ہوں کہ چمنستان ظہور میں، معنوی جمال و جلال کے ساتھ خراماں و شاداں جا رہا ہوں اور غیب کے نہاں خانوں سے چاند چہرے والی خوب صورت عورتیں نقاب ہٹائے میری نگاہوں کے سامنے جلوہ کناں ہو رہی ہیں۔ حقایق کی پوشیدہ تجلیات کی شعاعیں، زمینی و آسمانی اشیا اور کونی و ربانی اسرار میرے صفحۂ دل پر ظاہر اور عیاں ہو گئے۔

مثنوی

آئینۂ دل چون شد صافی و پاک
نقشہا بینی برون از آب و خاک
نقش را بینی و ہم نقاش را
فرشِ دولت را و ہم فراش را
چون خلیل آمد خیال یار من
صورتش بت، معنی او بت شکن

جب صبح صادق ہوئی، میں اپنی بے خودی سے ذرّہ بھر باہر آیا تو ملک علیین روانہ ہونے والے کی تجہیز و تکفین، غسل، جنازہ اور تدفین کے انتظامات کیے اور جب سورج ایک نیزے تک اوپر آ گیا تو شاہ فیض جود طاب ثراہ کا وجود لحد فردوس مہد کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ اہم فریضہ انجام دینے کے بعد جب ہم اپنے گھروں اور ٹھکانوں کو لوٹے تو راستے میں پڑنے والے ہر ہر قدم پر مکتب ہائے عالم بالا سے منادی کی آواز میرے کانوں کو پہنچ رہی تھی۔ ”آ اے دولا! جسے دسے تسے مولا“ خلقِ خدا، کیا بڑے، کیا چھوٹے، کیا مرد، کیا عورتیں، کیا ہندو، کیا مسلمان، راستے کے درمیان ہی لوگوں کا جم غفیر میرے گرد اکٹھا ہو گیا اور سب مل کر با آواز بلند پکارے ”دم ہو دولا دریائی، تنگی گئی، فراخی آئی“۔ جب میں اپنے گھر پہنچا اور نماز ظہر کے وقت منگو، طبیب سے دوا لے کر واپس آیا تو میری دگر گوں حالت دیکھ کر سمجھ گیا کہ آفتابِ نصیب کس کے سر پر چمکا اور خلعتِ دولت کس کے زیب تن ہوئی۔ اس کی فطرت میں موجود رگ حسد پھڑکی اور بخل کے غبار نے اس کی آنکھوں کی بصارت چھین لی۔ وہ اپنے بیٹے کو لے آیا اور وہ دونوں مجھ پر پل پڑے۔ اچانک ڈنڈے اور لاتوں سے اس قدر طاقت سے میرے جسم پر ضرب لگائی کہ یوں محسوس ہوا کہ میری جلد کے نیچے موجود تمام ہڈیاں چور چور ہو گئی ہیں۔ جب میں ضرب کی شدت سے بے ہوش ہو گیا تو مجھے وہیں چھوڑ، شاہ شیدا کی متبرک گدڑی میرے کاندھوں سے کھینچ، اپنے گھر چلے گئے۔ باوجودے کہ میں سات روز تک بے حال رہا، لوگ جوق در جوق آ رہے تھے، جونہی ذرا سی قوت بحال ہوئی میں پھکوئی پورہ چھوڑ کر سیال کوٹ آ گیا۔

الغرض، دس سال کا عرصہ شیخ دولا قصبہ سیال کوٹ میں قیام پذیر رہے۔ عوام و خواص کی

عقیدت اور حلقۂ ارادت مندی میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا۔ایک بڑا تالاب اور ایک خوشبودار باغ، جسے مولوی عبداللہ[شاید مولانا عبداللہ لبیب سیالکوٹی فرزند مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی (مترجم)] نے ختم کر کے اپنا محلہ آباد کرلیا ہے، تعمیر فرمائے۔حافظ بیابانی کے مزار کے گنبد سے متصل امام علی الحق کے مزارِ اقدس کے گنبد کی تعمیر کے علاوہ سیال کوٹ کے نواح میں نالہ آیک پر، جہاں برساتی طغیانی سے لوگوں کی ہلاکت کا اندیشہ رہتا تھا، ایک بڑے پل کی تعمیر کا آغاز کیا۔اس کے علاوہ شاہ شیدا اور پیر سبز کے روضے کی بنیاد رکھی۔شہر سے باہر مغرب کی سمت وسیع میدان میں عید گاہ کی عمارت تعمیر کروائی۔کنویں، خانقاہیں، درویشوں کے نشیمن اور تکیہ گاہیں، جو انھوں نے بنوائے، ان کا شمار ممکن نہیں۔اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے منگو بھی جان گیا کہ اس کا حسد شیخ دولا کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تو شاہ شیدا کی وہ متبرک گڈری لا کر شیخ کے حضور پیش کی اور بحیثیت خدمت گار، ان کے حضور حاضر ہوا۔خدا جنھیں بڑا بناتا ہے، ان کا شیوہ خطا پوشی اور عطا و بخشش ہے، لہٰذا شیخ بھی اسی روش کے مطابق اسے بہت عزت و تکریم دیتے تھے اور احسان و جود سے اس کی دلجوئی فرماتے۔تمام عمر کبھی آنکھ کے اشارے سے بھی اس پر غصہ کا اظہار نہ کیا اور نہ ہی کبھی اس کی کوئی درخواست ردّ فرماتے تھے۔یہی وہ امر ہے جسے دانائے راز، واعظ شیراز سعدی نے یوں بیان کیا ہے:

قطعہ

شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا
دلِ دشمنان ہم نکردند تنگ
ترا کی میسّر شود این مقام
کہ با دوستانت خلافست و جنگ؟

شیخ دولا کے خرقہ کی نسبت:

حضرت شیخ دولا قدس اللہ العزیز نے خرقہ اور درویشی جبہ شاہ شیدا کے دست مبارک سے پہنا۔انہوں نے شاہ مونگا سے، شاہ مونگا نے شاہ تن برہنہ سے، شاہ تن برہنہ نے حافظ بیابانی سے، حافظ بیابانی نے سید طاہر سے اور سید طاہر نے امام ناصر سے۔اس سے اوپر سند خلافت کرسی مجھ تک نہیں پہنچی۔البتہ شیخ دولا کی زبانی سنا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ ہمارا سلسلہ امام قاتل الکفار، محی

اسلام امام علی الحق رحمۃ اللہ علیہ سے جا ملتا ہے۔ اس سلسلے کو "مجذوبیہ" کہا جاتا ہے، ان معنوں میں کہ دیگر مشائخ اور سلاسل میں آئین ارشاد، ذکر و فکر کی تلقین، اکتساب تصفیہ قلب اور تزکیہ روح مقرر ہے، اور جد و جہد، محنت، ریاضت، خلوت و عزلت کے بعد ہی حضور و قرب کا مقام اور قرب الٰہی کا حصول ممکن ہوتا ہے جب کہ سلسلۂ مجذوبیہ میں محض فیضِ نظر ہے۔ اس سلسلے کے مرشدین میں سے ہر کسی کو، طبقہ بہ طبقہ، اپنی تقدیر اور نصیب کے مطابق عنایات اور کرامات عرفان حاصل ہوئی ہیں۔۔ صرف ایک جذب نظر سے اس کے دل سے حجابات غیر ہٹا کر اسے بارگاہ عظمت میں مرتبے کا قرب بخشا گیا ہے۔ اور پشت بہ پشت ایک یا دو خلف بطور سجادہ نشین یہ بلند مراتب حاصل کرتے آئے ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں ہوتے۔ جی ہاں:

اگر قطرہ باران ہمہ دُرّ شدی

چو خر مہرہ بازار ہا پر شدی

حاصل کلام یہ کہ سخی سیال کوٹ میں شیخ دولا کے قیام کو دس سال ہوئے تو ایک دن انہیں امام علی الحق رحمۃ اللہ علیہ کی جانب سے بشارت دی گئی کہ عوام و خواص عقیدت مندوں کا جم غفیر آپ کے ہاں رجوع رکھتا ہے۔ ان میں سے کسی کو یہ توفیق نہیں کہ ہمارے روضہ منورہ کی زیارت کی سعادت حاصل کرے۔ لہٰذا اس شہر کے ساکنین اور زائرین ہماری زیارت کی برکت سے محروم ہیں اور ہم خود کو فاتحہ خوانی کے وسیلے سے مدد سے محروم پاتے ہیں۔ آپ ہماری یہ جگہ ہمارے حوالے کرتے ہوئے خود قصبہ گجرات چلے جائیں اور وہاں کے ساکنین کو پر انوار دیدار کے فیض، رہنمائی، ہدایت، اپنی عطا اور دعاؤں سے بہرہ ور کریں۔

شیخ اس حکم کی تعمیل بجالاتے ہوئے سخی سیال کوٹ سے عازم سفر ہو کر قصبہ گجرات تشریف لے آئے اور شہر کے سرے پر مشرقی سمت، نالے کے درمیان ایک چھوٹے سے خالی قطعہ زمین پر، جو ایک جزیرے کی مانند تھا، قیام فرمایا اور ایک حجرہ تعمیر کیا۔ جہاں اس وقت آپ کا مزار مبارک واقع ہے۔

زائرین اور معتقدین کا ہجوم اس قدر بڑھا کہ رات دن کے آٹھ پہروں میں سے کسی وقت بھی خانقاہ مرد و زن کے انبوہ کثیر سے خالی نہ ہوتی تھی۔ اور نقدی اور اجناس بصورت نذرانہ بارش کی مانند برستیں اور دریا کی طرح بہادی جاتیں، یعنی کثرت سے وصول ہوتیں اور اسی دریا دلی سے

محتاجوں میں تقسیم کردی جاتی تھیں۔ رجوع خلق کا یہ سلسلہ شیخ کی زندگی بھر جاری رہا اور کبھی اس میں کمی واقع نہ ہوئی۔ چند روز بعد انہوں نے اس نالہ پر ایک بڑا پل تعمیر کردیا، جس میں سیلاب آنے سے شہر میں تباہی ہوتی تھی اور برسات کے موسم میں مسافروں اور راہ گیروں کی آمد و رفت کا سلسلہ مسدود ہو کر رہ جاتا تھا۔

ایک روز لوگوں نے شیخ کو اطلاع دی کہ برسات اور طغیانی کا موسم ہے، بھٹے کام نہیں کر رہے اور پختہ اینٹوں کی فراہمی ممکن نہیں رہی، لہٰذا پل کی تعمیر کا کام رک گیا ہے۔ اب کیا کیا جائے؟ یہ بات سن کر شیخ نے فوراً بیلچہ اٹھایا اور صحرا کی جانب روانہ ہو گئے۔ عوام الناس بھی ان کے پیچھے ہو لیے۔ باغ شہر یار سے ملحقہ صاف ستھری زمین پر، جہاں کسی قسم کی قدیم عمارت کے آثار کا نام و نشان تک نہ تھا، بیلچہ زمین پر مارا، اور اس کے بعد بیل داروں کو زمین کھودنے کا حکم دیا۔ جب وہ ایک ہاتھ زمین کھود چکے تو اس کی تہہ سے بڑی اینٹوں کا ایک خزانہ برآمد ہوا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ اینٹیں حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے کی ہیں۔ حکم ہوا کہ اینٹوں کو پل کی تعمیر گاہ تک پہنچانے والے کو ایک اینٹ کے بدلے ایک تنکہ اجرت ملے گی۔ اس اعلان کے بعد مزدور پل پڑے اور تھوڑے دنوں میں ہی اینٹوں کے یہ ڈھیر پل کی تعمیر گاہ پر منتقل کر دیے گئے اور چھ ماہ کی مدت میں اس عمارت کی تعمیر پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔

نقل ہے کہ (اس پل کی تعمیر کے دوران) ایک دن اس قدر پیسے نہ تھے کہ تمام مزدوروں کو اجرت ادا کی جا سکتی۔ شیخ نے اپنے دست مبارک سے زمین کھودی۔ خدا کی قدرت سے تنکوں کا ایک خزانہ برآمد ہوا۔ آپ نے اتنے پیسے، جو مزدوروں کی اجرت کے لیے کافی تھے، لینے کے بعد دوبارہ اس جگہ پر مٹی ڈال دی۔ جب رات ہوئی تو ایک مزدور وہاں گیا اور خاصی گہرائی تک زمین کھود ڈالی، مگر زر کا کچھ سراغ نہ پایا۔ تمام شب وہ اسی کوشش میں لگا رہا آخر تھک ہار کر صبح سویرے پل کی تعمیر گاہ کی طرف واپس لوٹ گیا۔ شام کے وقت جب شیخ مزدوروں کو اجرت دے رہے تھے، وہ شخص حاضر ہوا۔ آپ نے ازراہ مہربانی اسے دوگنی اجرت سے نوازا اور فرمایا: اے دوست، ایک اجرت تمہارے دن کے کام کی ہے اور دوسری رات کی۔ وہ شخص سمجھ گیا کہ کیا بات ہے اور پھر اپنے دوستوں کو بھی ساری حقیقت کہہ سنائی۔

آنچہ اندر آئینہ بیند جوان
پیر اندر خشت می بیند ہمان

شیخ دولا کی طرف رجوع خلایق:

اس بندۂ ناچیز کو، جو درویشوں کے قدموں کی خاک اور صوفیان حق اندیش کے راستے کی دھول ہے، بچپن میں بروز جمعہ، جب سبق سے چھٹی ہوا کرتی تھی، میری مہربان والدہ چند روٹیاں اور سبزی پکا کر دیتی تھیں اور کہتی تھیں کہ شیخ کی خدمت میں لے جا کر پیش کرو اور اپنے لیے دعا کی درخواست کرو۔ میں یونہی کرتا تھا۔ شیخ بھی از راہ لطف و کرم مجھ یتیم پر بہت مہربانی اور توجہ فرماتے تھے۔ جس قدر نذرانے بھی وصول ہوتے، شیخ ان کے حصے کرتے اور لوگوں میں تقسیم کر دیتے۔ اسی مجلس میں قدرت الٰہی کا تماشہ جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، یہ ہے کہ شیخ کے اردگرد ہمہ وقت لوگوں کا جم غفیر اس حد تک رہتا کہ قلعہ بندی کی سی کیفیت ہوتی۔ زائرین کو پابوسی کا موقع بھی بمشکل میسر آتا۔ بلکہ ہجوم اس قدر ہوتا کہ لوگ ایک دوسرے کے اوپر گر رہے ہوتے تھے اور جو شخص گر جاتا، اس کا اٹھنا محال ہو جاتا۔ مختلف مذاہب کے لوگ شیخ کی خدمت اور عقیدت میں ہم خیال تھے۔ بعض اوقات ان کی زیارت کی غرض سے آنے والے مسافروں کو زائرین کے ہجوم کی وجہ سے شیخ تک پہنچنے کا موقع نہ مل پاتا اور وہ مجبوراً کسی دور دراز کونے میں کھڑے ہو کر حیرت سے خلق خدا کو دیکھتے رہتے۔ شیخ کو انکشاف باطن کی بنا پر ان کے شوق اور حالت انتظار کا ادراک ہو جاتا، لہٰذا وہ اٹھتے، لوگوں کے ہجوم کو ایک طرف ہٹا کر ان کے قریب تشریف لے جاتے، خیر مقدمی کلمات کہتے، احوال پرسی کرتے اور انہیں تبرک عنایت کر کے رخصت فرماتے اور پھر آ کر اپنی جگہ پر براجمان ہوتے۔ جو کوئی آپ کا روئے مبارک دیکھتا، بے اختیار سر سجدے میں رکھ دیتا۔ بعض ظاہر پرست اور کور فہم اس فعل سے انکار کر کے اٹھ جاتے [یعنی اعتراض کرتے]۔ وہ یقیناً اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ کہا جاتا ہے: ''ہر وہ دل اور سینہ، کہ جس میں نورِ الٰہی چمکتا ہو اور ہر وہ پیشانی جو جلوۂ رحمانی کی تجلی سے روشن ہو، کعبۂ معنوی اور قبلۂ حقیقی ہے۔''

تا بکرد آن خانہ را در وی نرفت
واندرین خانہ بجز آن حَیّ نرفت

پس کس میں اتنا یارا تھا کہ انہیں دیکھے اور سربسجود نہ ہو۔ لیکن شیخ نے اپنی زبان سے کبھی اس

امر کا حکم نہ دیا تھا اور نہ ہی اسے پسند کیا، بلکہ اکثر اوقات منع کرتے تھے۔ لیکن عوام الناس کا یہ فعل بے اختیار ہوا کرتا تھا۔ طرفہ یہ کہ وہ لوگ جو ان کی غیر موجودگی میں انہیں جھٹلاتے تھے، جب کبھی ان کے حضور آتے تھے تو تقدیم آداب اور نیاز مندی میں دوسروں سے سوگنا زیادہ سبقت لے جاتے۔ لوگوں کا ہجوم کبھی کم نہ ہوتا تھا۔ علماء، فقراء، صالحین، مشائخ، منصفین اور سادات سبھی آپ کے پاس آتے تھے۔ ہندو، سنیاسی اور بیراگی، جو اہل ہند کا معتبر طبقہ ہیں، ان کا بھی شمار نہیں تھا اور بطور نذر، نقد، اجناس، پارچہ جات، سامان تجارت، خوردنی اشیاء، مشروبات، حیوانات، درندے، ہر قسم کے پہاڑی، سمندری اور صحرائی پرندے، جو ہر ملک اور دیار سے آتے تھے۔ تمام تحایف اور نذور حاضرین کو بخش دی جاتیں۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کسی قیمتی یا نادر چیز کو اپنے پاس رکھنے کا خیال شیخ کے دل میں آیا ہو۔ سبحان اللہ، ترک علایق اس قدر تھا کہ کبھی کسی شے کی جانب رغبت کا اظہار نہیں کیا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ لذیذ طعام، خوبصورت لباس اور عمدہ قالین کی غرض و غایت کیا ہے۔ مخلوق کی فیض رسانی کا یہ عالم تھا کہ کوئی شخص آپ کے خوان احسان سے محروم نہ تھا۔ غرباء، مساکین، یتیموں اور محتاجوں کے لیے تین مقامات پر لنگر جاری کیے تھے اور ان تینوں مقامات، یعنی سیال کوٹ، گجرات اور پل دیوگہ پر دس دس من کھانا پکایا جاتا تھا۔

شیخ دولا کا اموال دنیا سے استغنا:

جاننا چاہیے کہ درویشوں کا نذور اور ہدیے قبول کرنے سے انکار اور دوسرے کے لیے ایثار نہ کرنا، ترک علایق کا درجہ نہیں رکھتا، بلکہ بخل کے برابر ہے۔ اس لیے کہ ان کا یہ عمل ارادت مندوں کو خیرات کی سعادت سے بے بہرہ اور محتاجوں کو اپنی عطا و بخشش سے مایوس کرنے کے مترادف ہے۔ تارکِ محسن وہ ہے جو بذات خود شہوات نفسانی سے قطعاً بے نیاز ہو اور اگر کوئی مال دار عقیدت مند اللہ کی محبت میں اس کے لیے تحایف اور ہدیے لائے تو وہ اسے نہ ٹھکرائے، بلکہ اس مال کے ذریعے مستحقین کی ضروریات پوری کر دے، کیونکہ اس صورت میں دونوں کا فائدہ ہے۔ شیخ کو لوگوں کے دلوں میں اترنے اور گھر کرنے کا ملکہ اس قدر حاصل تھا کہ ہر کس و ناکس یہی سمجھتا کہ شیخ جس قدر مہربان اس پر ہیں، کسی اور پر نہیں۔ عجز و انکسار شیخ کی ذات اقدس میں اس قدر تھا کہ سب کو اپنے سے بہتر خیال کرتے تھے۔ ہر کسی کی تعظیم و تکریم اور تواضع و تسلیم کا خیال رکھتے تھے۔

استغنا کی تشریح:

ایک روز ایک عزیز نے سوال کیا کہ بعض درویش کسی کی بھی تواضع وتکریم نہیں کرتے اور کسی کے لیے بھی کھڑے نہیں ہوتے۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ اس روش کو اکثر احباب، فقرو استغنا کا نام دیتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ استغنا، غنی مطلق کی صفت ہے اور انسان، جس کی تخلیق کی غرض، وغایت محض بندگی ہے، اگر استغنا برتتا ہے تو اسے استغنا نہیں، بلکہ غرور وتکبر، خودنمائی اور خود پرستی کی علامت تصور کیا جائے گا۔ اس تنگ راستے میں جو کوئی سرنگوں اور بے سروسامانی کے عالم میں گذر گیا، امن وسلامتی کے ساتھ منزل مقصود کو پہنچا، اور جس نے سر اونچا کیا وہ اپنے سر کے ساتھ کھیلا۔ میرے پیارے! درویشی اور خاک نشینی کا دستور خود بینی سے گریز ہے، نہ کہ گوشہ نشینی اور دوسروں کی عیب جوئی اور نکتہ چینی کرنا۔ خود پرست پارسا ابلیس ہے، جبکہ تابع فرمان اور مطیع، حضرت آدم وخلیل اللہ ہیں۔

شیخ دولا کی ظاہری وضع قطع:

شیخ کی ظاہری وضع قطع اور اطوار مجذوبانہ تھے۔ پنجابی زبان میں سادہ گفتگو کرتے، لیکن ان کا کردار وعمل زمانے کے تمام دانشوروں کے لیے باعث تعجب وحیرت تھا۔ چونکہ قصبہ گجرات، عرب، عجم، ایران، توران، ہند، سندھ، کشمیر و کاشغر وغیرہ شاہراہ پر واقع ہے، لہٰذا سلاطین، خوانین، امراء، علماء، صالحین، غرباء، سیاح، ہر ملک ودیار کے تاجر، غرض یہ کہ کوئی ایسا نہ تھا جو اس راہ سے نہ گذرے اور شیخ کی زیارت نہ کرے، اور وہ لوگ جس زبان میں اظہار مدعا کرتے، شیخ بھی اسی زبان میں انہیں جواب دیتے اور ان کی تسلی وتشفی کرتے اور اسی طرح بعض اوقات جانوروں کی آواز سن کر سمجھ لیتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ چنانچہ جیسا کہتے تھے ویسا ہی ظاہر ہوتا تھا، اور اس مرتبہ کو "کشف اللسان" کہتے ہیں۔

ہر کہ منظور شد سلیمان را
چو نداند زبان مرغان را

شیخ موٹے کھدر کی لنگی، خرقہ اور کفنی زیب تن کرتے۔ سر پر کبھی دستار اور کبھی سرخ رنگ کی اونی ٹوپی اوڑھتے، جس پر موٹا کپڑا لپیٹ لیتے۔ پاؤں مبارک میں اکثر وہ معمولی جوتی ہوتی، جو عموماً کشمیری پہنتے ہیں۔ کبھی چمڑے کی جوتی بھی پہنتے۔ ہمیشہ زمین پر ہی بیٹھتے، کبھی بوریا یا گھاس پھونس پر بھی نشست نہ رکھتے۔ قالین، غالیچہ یا نمدے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اکثر مراقبہ

میں رہتے۔ جب زائرین نذریں ہاتھ میں لیے پاس آ کر کھڑے ہو جاتے تو استغراق سے باہر آتے، اپنے دست مبارک سے نذر تقسیم کرتے اور دوبارہ مراقبہ میں چلے جاتے اور بلاضرورت گفتگو نہ فرماتے، پورا دن اسی طور سے گذار دیتے۔

شیخ دولا کا حلیہ:

آپ کا حلیہ مبارک کچھ یوں ہے۔ چہرے کی گندمی رنگت، کشادہ پیشانی، باہم پیوست ابرو، سیاہ آنکھیں اور آنکھ کی سفیدی میں سرخ ڈورے، بائیں آنکھ کے نیچے ایک انگلی کے فاصلے پر رخسار پر سیاہ تل، درمیانہ قد، نہ بہت لمبا، نہ بہت چھوٹا، نہ موٹے، نہ دبلے، دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی غائب تھی جس کا ان کے ہاتھ سے الگ ہونے کا قصہ اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے۔ ان کے ہاتھ دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ مضبوط، لمبے اور چوڑے تھے۔ ریش مبارک بہت گھنی اور دراز تھی۔ اکثر سر جھکائے بیٹھے رہتے تھے اور گھمبیر آواز میں بات کرتے۔

کئی مست مجذوب، جنھیں کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں ہوتا تھا، ان کے آگے پیچھے بیٹھے رہتے۔ شیخ ان لوگوں کے ساتھ انتہائی خلوص سے پیش آتے اور اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتے۔ بعض اوقات یہ لوگ عالم دیوانگی میں شیخ کے حضور گستاخی بھی کر جاتے، لیکن آپ برداشت و تحمل کا مظاہرہ کرتے تھے۔ طے تھا کہ ہر جمعہ کے دن، پہلے پہر شیخ جاذبہٗ الٰہی سے جذب و مدہوشی میں چلے جاتے اور وہ اس حالت میں اپنے پرائے سے بے خبر ہو جاتے۔ اس جذب کے نزول کی علامت یہ تھی کہ جب دونوں ہاتھوں سے ریش مبارک کو لپیٹتے اور گرہ لگا دیتے، آنکھوں کا رنگ بدل جاتا، معلوم ہو جاتا تھا کہ طبع والا وجد و جذب کی کیفیت میں ہے۔ لوگ ادھر ادھر بھاگتے پھرتے اور دور سے ہی دیکھتے تھے۔ اس وقت مٹی کا وہ مٹکا، جو آپ کے سامنے دھرا ہوتا، ٹوٹ جاتا۔ اینٹیں اور پتھر برساتے تھے اور اگر اتفاق سے کوئی سامنے کھڑا رہ جاتا تو اس پر پتھروں، اینٹوں، ٹھیکروں کی اس طرح بارش ہوتی گویا اس کی کھال کے اندر کوئی ہڈی سلامت نہیں بچی ہوگی۔ جب مضروب سے اس بارے میں دریافت کیا جاتا تو وہ کہتا تھا کہ اسے کسی قسم کی چوٹ نہیں آئی یا تکلیف نہیں پہنچی۔ اس کے بعد جب شیخ عالم ہوش میں لوٹ کر آتے تو خلقت گویا ٹڈیوں اور چیونٹیوں کی مانند زمین کے ہر رخنہ اور درز سے نکل آتی اور دوبارہ وہی عطا و بخشش کا ہنگامہ گرم ہو جاتا۔ اس شخص کو، جسے جذب و جلال کے عالم میں ضرب پہنچی ہوتی تھی، انعام و اکرام

سے اس طرح نوازتے کہ وہ گھڑی بھر میں چین محسوس کرتا۔

شیخ دولا کی جانوروں اور پرندوں سے محبت:

شیخ جانوروں اور پرندوں سے بھی حد درجہ الفت رکھتے تھے۔ چنانچہ خانقاہ میں ہمیشہ چند ببر شیر، چیتے، سیاہ گوش، بھیڑیے، گیڈر، بندر، ریچھ، لومڑیاں اور بلیاں وغیرہ زنجیر اور رسّی سے بندھے رہتے۔ جنگلی بھینس جسے ہندی میں ''ارنہ'' کہتے ہیں، اور بیابانی گائیں، جنہیں ''سرہ گائے'' کہتے ہیں، جنگلی گھوڑے یعنی تانکھن اور گینڈا جن کی کھال سے ڈھال بنتی ہے، نیل گائے، ہرن، بارہ سنگھا، اڑیال، خرگوش، چکور، تیتر، بطخ، اود بلاؤ، کبک، کبوتر، سرخاب، بلبل، قمری، پپیہا، عندلیب، مور، ساردہ (سار ایک قسم کی چڑیا) ممولہ، کوئل، طوطے، شارک، انواع و اقسام کے پہاڑی، صحرائی، اور دریائی جانور جن کے نام بھی لغات میں دستیاب نہیں ہیں، آپ کی خدمت میں حاضر رہتے۔

شیخ دولا کا تعمیراتی کاموں سے شغف:

تعمیرات کے کام سے انہیں خاص شغف تھا۔ فرماتے تھے کہ مساکین کی امداد کا اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا۔ خانقاہ سے متصل نشیبی جگہ کو دو نیزے کے برابر مٹی ڈال کر زمین کے برابر کیا اور وہاں عیدین کی نماز کے لیے ایک بڑی اور پختہ مسجد کی بنیاد رکھی۔ اس کے نزدیک دو بڑے اور گہرے تالاب بھی تعمیر کرائے۔ ساکنین شہر ہر روز غسل اور کپڑوں کی دھلائی کے لئے ان تالابوں کے کنارے اتنی تعداد میں جمع ہو جاتے کہ ان کی باتوں اور دھلائی کے شور وغوغا میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ کچھ باغ، حمام، اور چند کنویں بھی تعمیر کروائے۔ دو مہمان سرائیں بنوائیں، ایک شہر میں اور ایک پل کے پاس۔ شیخ کی یہ روش تمام عمر اسی طرح جاری رہی۔ اگر کسی وقت تعمیراتی کام موقوف فرما دیتے تو بھی ایک ہزار نوے مزدور اور بیل دار ہر روز آپ کی خدمت میں حاضر رہتے جو ایک مقام سے مٹی اٹھا کر دوسری جگہ کو بلند کر دیتے اور پھر اس بلند کی ہوئی جگہ سے مٹی کھود کر دوسری نشیبی جگہ پر ڈال دیتے۔ آپ کا یہ فعل فقط محتاجوں اور خلق خدا کی فلاح و بہبود کی غرض سے تھا، ورنہ آپ کا دل ان تمام دنیاوی علائق سے بے نیاز تھا۔ دریائے دیوگہ پر ایک بہت بڑا اور طویل و عریض پل تعمیر کیا۔ اس پل کا واقعہ ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

پل دیوگہ کی تعمیر:

شاہ جہاں کی بیٹی بادشاہ بیگم نے اس سے قبل دو مرتبہ زر کثیر صرف کر کے دریائے دیوگہ پر پل تعمیر کروایا تھا۔ جب برسات آتی، طغیانی کی شدت سے پہلے ہی ریلے میں پل بہہ جاتا۔ بے چارے، مسافروں کا سامان بلکہ لوگ اور گھوڑے بھی جان بحق ہو جاتے۔ لہٰذا بادشاہ بیگم نے حاکم گجرات مرزا بدیع الزمان کو، جو عقل و فہم، تدبر اور تعمیراتی کاموں میں مہارت اور دیانت داری جیسے عمدہ اخلاقی خصائل سے مالا مال تھا، اپنے حضور طلب فرمایا اور کہا کہ میری دلی تمنا اس دریا پر پل تعمیر کروانا ہے، دو مرتبہ میری یہ کوشش رائیگاں گئی اور میری یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ اب کوئی ایسی تدبیر اختیار کریں کہ خواہ جس قدر زر صرف ہو، لیکن ایک ایسا مضبوط، پائیدار اور دیرپا پل تعمیر کیا جائے جو دوبارہ سیلاب سے نہ بہے۔

مرزا بدیع الزمان نے عرض کیا کہ دیوگہ تند رفتار اور پر تلاطم دریا ہے۔ اس پر ایک پائیدار پل کی تعمیر بظاہر ناممکن نظر آتی ہے۔ مگر شیخ دولا اس کام کو انجام دے سکتے ہیں۔ اگر وہ توجہ کریں تو اس کی پائیدار تعمیر ممکن ہے۔

یہ بات سن کر بادشاہ بیگم کا ذوق و شوق اور اشتیاق ہزار گنا بڑھ گیا۔ اسی روز ایک عرض داشت لکھ کر بارہ ہزار روپے کے ساتھ شاہ کی خدمت میں روانہ کی، جس کا مضمون یہ تھا:

"اگر شاہ نواز، گدا پرور شیخ کی، ازراہِ لطف و کرم اس عاجزہ پر نظر کرم ہو، تو یہ بارہ ہزار روپے پل کی تعمیر کے مصرف میں لائے جائیں۔ اس کے علاوہ بھی جس قدر روپیہ اس کام کے لیے درکار ہوگا، حضور کی ایماء پر پہنچا دیا جائے گا۔ اگر آپ کی خاص توجہ سے یہ مستحکم پل بن گیا تو یہ مہربانی ہوگی۔ شاید اسی وسیلے سے مجھ ناچیز کا نام اس دنیا میں جاوداں ہو جائے اور اس کا ثواب، نجاتِ اُخروی کا باعث بنے۔"

جب قاصد یہ عرض داشت اور نقدی لے کر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں نفس مضمون سے آگاہ کیا گیا تو ہنس کر فرمانے لگے: "اے بھائیو! ہم ہندوستانی لوگ ہیں، اور ہندوستانیوں کے رسم و رواج کے مطابق بیٹی کا مال لینا باپ کے لیے گناہ عظیم ہے۔ اور اس سے ہاتھ آلودہ کرنا عصیان الیم۔ چونکہ شاہ جہان کی بیٹی ہماری بیٹیوں جیسی ہے، اور اس سے کچھ لے کر خرچ کرنا گویا اس سرزمین کی رسم سے انحراف کرنا ہے۔ تم اس بیٹی کا یہ خط اور نقدی لے کر جس راہ

سے آئے ہو، اسی سے واپس لوٹ جاؤ، اور میری جانب سے جا کر صاحبزادی کی خدمت میں التماس کرو کہ آپ کے حکم کے بموجب دولا فقیر مٹھی بھر شکر اور راکھ لے کر دریائے دیوگہ کے کنارے جا کر بیٹھ جائے گا۔ ان شاء اللہ بہت عمدہ پل تعمیر ہوگا، جس کا ثواب اس صاحبزادی کو بخش دوں گا کہ حق تعالیٰ اپنے فضل سے اس دنیا میں ناموس اور آخرت میں خاطر خواہ نجات کا سبب قرار دے۔

الغرض شیخ نے اس رقم میں اپنی طرف سے چار ہزار روپے کا اضافہ کیا اور قاصدوں کو تبرک، بہت سی شیرینی اور نقد و اجناس دے کر رخصت کیا۔ جب وہ لوگ شہزادی کے پاس پہنچے اور شیخ کا پیغام اور اصل زر میں اضافہ کا قصہ کہہ سنایا تو بادشاہ بیگم نے کہا کہ میں لوگوں سے سنتی تھی کہ شیخ زیر زمین خزانوں اور دفینوں پر نظر رکھتے ہیں لیکن میں اسے وہم قرار دیتی تھی۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ اتنی نوازش و بخشش بغیر کسی مقام کے ممکن نہیں ہے۔ شہزادی کو کیا خبر تھی کہ کہتے ہیں ''جس کسی کی نظر حق پر ہوتی ہے، اس کے نزدیک خاک اور زر کی حیثیت یکساں ہے۔ بلکہ راکھ، زر سے بہتر ہے۔''

القصہ، شیخ گجرات سے دریائے دیوگہ تشریف لے گئے۔ دریا سے متصل آبادی، موضع بھنڈال کی حدود میں زمین اس قدر نیچی تھی کہ وہاں ہمیشہ قد آدم پانی کھڑا رہتا تھا۔ آپ نے بیل داروں کو حکم دیا کہ یہاں سے پانی نکال کر زمین کھودی جائے۔ جب بیل داروں نے پانی ہٹا کر پانچ ہاتھ زمین کھود لی، تو اس کی تہہ سے ایک قدیم عمارت برآمد ہوئی۔ اس عمارت سے اینٹیں اکھاڑ کر مذکورہ دریا کے کنارے لا کر ڈھیر کر دی گئیں۔ شیخ نے چند اینٹیں اپنے دست مبارک سے اٹھا کر عین دریا میں رکھ دیں۔ قدرت الٰہی سے ان اینٹوں کا وہاں رکھنا تھا کہ بہتا ہوا پانی رک گیا۔ چنانچہ مناسب جگہ دیکھ کر پل کی بنیاد رکھ دی گئی اور تعمیر شروع کر دی گئی۔ تعمیر مکمل ہونے تک آپ بذات خود وہیں موجود رہے۔ آج جب کہ اس کی تعمیر کو پچاس سال کا عرصہ گذر چکا ہوگا، نہ کبھی سیلاب نے اس پل کو نقصان پہنچایا اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی رخنہ یا دراڑ دیکھنے میں آئی ہے۔

دیوگہ کی وجہ تسمیہ

اس واقعہ کے راوی، اس دریا کا نام دیوگہ پڑنے کی وجہ تسمیہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس

جگہ ایک بے حد قوی دیو کا مسکن تھا اور وہ کسی انسان کا تصرف وہاں برداشت نہیں کرتا تھا۔ لہذا اس سے قبل صاحب حیثیت افراد نے چند مرتبہ زر کثیر کے مصرف سے یہاں پل تعمیر کروایا، جو کبھی ایک سال سے زیادہ قائم نہ رہا۔ جب شیخ وہاں گئے تو وہ دیو، ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور وطن سے بے دخلی پر احتجاج کیا۔ شیخ نے اس سے فرمایا کہ یہ جگہ ہم نے اس پیر مرد [شاید خضر علیہ السلام] سے لے لی ہے۔ لہٰذا تو اس مقام کو ترک کر کے کہیں اور چلا جا، ورنہ میں تجھے ہلاک کر دوں گا۔ ناچار دیو جلا وطنی اختیار کر کے شیخ سے رخصت ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ بوقت کوچ اس کے قوم قبیلے کی طرف سے اس قدر شور و غوغا اٹھا جیسے کوئی شاہی لشکر کوچ کر رہا ہو۔ ایک پہر تک برپا رہنے والے اس شور و غوغا میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ بعد ازاں شیخ اس عمارت کی تعمیر میں مشغول ہو گئے اور مختصر مدت میں تعمیر مکمل ہوتے ہی گجرات لوٹ گئے۔

کہتے ہیں بلھب رائے نامی ایک ہندو، شیخ سے خاص عقیدت رکھتا تھا۔ اس سے پہلے وہ شاہزادہ دارا شکوہ کی سرکار میں دیوان رہا تھا۔ شہزادے کی حکومت زوال پذیر ہونے کے بعد وہ ملازمت ترک کر کے شیخ کی خدمت میں آ رہا۔ شیخ جب تک زندہ رہے، اسے پانچ روپے روزینہ دیتے تھے اور از راہ شفقت اسے ''سدا بسنت'' کے نام سے پکارتے تھے، کیونکہ وہ ہمیشہ خوش حال اور خوش پوش شخص تھا اور ہمہ وقت خود کو خوشبوؤں سے مہکائے رکھتا تھا۔ ایک روز اس نے عرض کیا کہ حضرت زیرِ زمین اینٹیں نکالتے وقت بیل داروں کے سر پر کھڑے رہتے ہیں اور لکڑی کے عصا سے لکیر کھینچ کر فرماتے ہیں کہ اس طرف سے اینٹیں نکالی جائیں، اور دوسری سمت چھوڑ دی جائے۔ اس میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ویرانوں اور قدیم خرابوں میں سانپ اور بچھو ہوتے ہیں۔ جس طرف میں اس قسم کی کوئی بلا یا آفت دیکھتا ہوں، وہاں سے روک دیتا ہوں، اور دوسری سمت، جہاں سے اینٹیں نظر آتی ہیں، نکال کے کام میں لے آتا ہوں۔

دنیاداری اور فقر میں فرق:

کیا بات ہے ان بلند نگاہ لوگوں کی اور کیا خوش نصیب عالی نظر کیمیا اثر لوگ ہیں جو خاک و خشت کو زر و جواہر سے افضل خیال کرتے ہیں، اور دنیاوی مال و متاع ان کے سامنے ہیچ ہیں۔ ان پست فطرت لوگوں کا مرتبہ، اُن لوگوں کے برابر کیسے ہو سکتا ہے، جو لالچ سے کُتّے کی مانند اس مردار ہڈی کو ہر جانب سے لپکتے ہیں اور بلی کی طرح شیریں اور تر نوالے تلاش کرتے ہیں۔ وہ جن کے

دل دنیا اور جاہ وشہوت کی جانب مائل ہیں، ہرگز اس کے برابر نہیں ہو سکتے، جس نے تقویٰ کی لگام سے اپنے پُرشہوت نفس پر قابو پا رکھا ہے۔ فرمانِ حق سے ہٹ کر قدم نہیں بڑھاتا، اور نہ ہی کوئی کام کرتا ہے بلکہ ایک ہی طرف کا ہو کر رہ گیا ھے۔ **لا یتحرک الّا باللہ و لا یسکن الّا باللہ و لا یتکلم الّا باللہ۔**

یہ لوگ اگر کھاتے ہیں تو ان کا مقصد لذتِ کام ودہن نہیں، بلکہ بقدر ضرورت کھاتے ہیں تاکہ عبادت کے لیے قوت حاصل کر سکیں۔ ان کا محوِ خواب ہونا بھی راحت وآسایش کے پیش نظر نہیں بلکہ عبادت کے لیے تجدید قوت کی غرض سے ہے۔ اگر حال کی طرف میل کرتے ہیں تو اس کا مقصد بھی راحت فقر کا حصول ہے، نہ کہ دنیاوی جاہ وحشمت کا۔ **رجال لا تلھیھم تجارۃ و لا بیع عن ذکر اللہ** [سورۃ نور، ۳۷]

امام غزالی سے لوگوں نے کہا کہ تو خود کو درویش سمجھتا ہے اور تمہارے اونٹوں اور گھوڑوں کے کئی اصطبل ہیں؟ آپ نے فرمایا: میں نے اصطبل کا کھونٹا زمین میں گاڑا ہوا ہے، اپنے دل میں نہیں۔

شیخ دولا کی فراست واخراجات:

ایک روز بلھب رائے نے پوچھا حضرت آپ کس طرح جان لیتے ہیں کہ کسی جگہ زیر زمین اینٹیں موجود ہیں، جبکہ اس جگہ بظاہر کسی قدیم عمارت کے آثار بھی نظر نہیں آرہے ہوتے؟ آپ نے فرمایا کہ میں قدیم آبادیوں کی مٹی اور ٹھیکریوں کی حالت دیکھ کر وہاں اینٹوں کی موجودگی کا پتا چلا لیتا ہوں۔ لیکن امر واقعی یہ ہے کہ پاک روان عالم معانی، جنہیں سالکان مسالکِ حقیقت اور مالکان ممالکِ معرفت کہا جاتا ہے، جو کچھ بھی دیکھتے ہیں اور سنتے ہیں، حق سے سنتے ہیں۔ ان کی نظر سے وہ نحیف گائے کہ جس کے سینگوں پہ زمین ٹکی ہوئی ہے، پوشیدہ نہیں، زیر زمین اینٹوں کی بابت جان لینا تو معمولی بات ہے۔ بلھب کو ادراک ہو گیا کہ شیخ کی نگاہ کی حد کہاں تک ہے۔

معمول تھا کہ ہر جمعہ کے روز شہر کے سارے بچے شیخ کی خانقاہ میں حاضر ہوتے اور غزلیں، نغمے، چھ بولے، اور ریختہ پڑھتے، بچگانہ کھیل کھیلتے۔ شیخ بہت خوش ہوتے اور ان سب کو شکر، شیرینی، اور نقدی بطور انعام دیتے تھے۔ ان کے استادوں کے لیے بھی ہدیے اور تحایف بھیجتے تھے۔ اسی طرح اتوار کے دن شہر کی تمام بچیاں آتیں۔ شہر اور گرد ونواح سے تمام لوگ، یعنی، عورتیں، مرد، امیر، غریب، غرض کوئی ایسا نہ تھا جو ہر ہفتے زیارت کے لیے نہ آتا ہو۔ جبکہ

عیدین، بیساکھی، اور نوروز کے مواقع پر زائرین کی کثیر تعداد کے لشکر جمع ہو جاتے تھے۔ اس خانقاہ فیض دستگاہ میں بخشش، انعام، خاص و عام کی مہمان داری کے علاوہ روزمرہ اخراجات کی غرض سے مبلغ ساٹھ روپیہ مختص تھے، وظیفہ خواروں کے علاوہ خانقاہ میں موجود تمام چرند و پرند، درندوں اور حیوانات پر بلا امتیاز خرچ کیے جاتے تھے۔

شیخ دولا کا سدو پرچون فروش کا قرض کی اتارنا:

سدو نامی پرچون فروش نے، جو روزمرہ سودا سلف پہنچایا کرتا تھا، ایک روز شیخ کی خدمت میں درخواست کی کہ تقریباً نوسو روپیہ اس کی دکان سے ادھار لیا جا چکا ہے، اور دکان کا کل سرمایہ یہی تھا، جو استعمال میں لایا جا چکا ہے، اگر یہ رقم اسے عنایت کر دی جائے تو وہ اپنی دکان میں نئے سرے سے سامان ڈال سکتا ہے اور روزمرہ کی خدمت بجا لا سکتا ہے۔ شیخ نے سنی ان سنی کر دی۔ اس نے دوبارہ عرض کیا، آپ نے پھر اغماض برتا۔ اس نے تیسری مرتبہ پھر التجا پیش کی تو شیخ جبین مبارک پر بل ڈال کر یوں گویا ہوئے، بابا سدو، تو نے پہلی نادانی تو یہ کی کہ ان گھاس پھونس کے جھونپڑوں میں رہنے والے خاک نشین گدڑی پوشوں کو قرض دیا اور ادھار کھلایا، اب وصولی کرتے ہوئے پھر نادان نہ بنو، اور جس طرح بھی بن پڑے، جو کچھ ان سے ملے، آہستہ آہستہ وصول کرتے رہو، ورنہ اس کم حوصلگی اور جلد بازی سے سوائے پھٹے ہوئے خرقے اور بجھی ہوئی چنگاری کے کیا حاصل ہوگا؟

سدو اپنی اس گستاخانہ حرکت پر شرمندگی محسوس کرتے ہوئے خاموش ہو رہا اور حیرت زدہ دکان میں آ کر بیٹھ گیا۔ جب رات کا ایک پہر گذر گیا اور لوگوں کی آمد و رفت موقوف ہو گئی تو شیخ نے ایک خادم کے ذریعے سدو کو بلا بھیجا۔ سدو بیان کرتا ہے:

"جب میں گیا تو شیخ ایک تاریک حجرے میں بیٹھے تھے۔ میرے جانے پر غیب سے ایک شمع روشن ہو گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ زر کا ایک ڈھیر حجرے کے ایک کونے میں پڑا ہے۔ شیخ نے اپنی زبان کرامت ترجمان سے کہا کہ بابا سدو! تو آج دن میں افسردہ ہو گیا تھا، آ، اور جس قدر قرض ہمارے ذمہ واجب ہے، اس ڈھیر میں سے اٹھا لے جا۔ اگرچہ پہلے تو اس عجیب مشاہدے سے میرا دل خوفزدہ ہوا، لیکن ان کے حکم کے مطابق اس ڈھیر میں سے نوسو روپیہ گن کر الگ کیے۔ اس رقم میں سے آدھی اپنی جھولی میں ڈال کر دکان میں لے آیا۔ جب دوبارہ واپس آیا صرف وہی

رقم، جس کا نصف میں لے جا چکا تھا، وہاں رکھی تھی، اور روپوں کا وہ ڈھیر نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ میں نے عرض کی یا حضرت! روپوں کا وہ ڈھیر، جسے اٹھانے کے لیے دس ہاتھی درکار ہوں، کہاں گیا؟ فرمایا" بابا سدو: یہ بازاری بے وفا کتا ہمیشہ میرے پاس ڈھیر کی شکل میں آتا ہے، لیکن چونکہ ہم اس سے بے نیاز ہیں، لہذا جس راہ سے یہ آتا ہے، اسی راہ سے لوٹا دیا کرتے ہیں۔ مگر آج تیرا قرض ادا کرنے کی غرض سے کسی قدر کام میں لایا گیا اور باقی واپس چلا گیا۔ تم یہ بات کسی کو مت بتانا۔"

سدو نے یہ بات شیخ کی زندگی میں راز ہی رکھی۔ البتہ ان کی وفات کے بعد اس کا اظہار کیا اور اس فقیر نے بھی یہ واقعہ اس کی زبان سے ہی براہ راست سنا۔

مسمات پچھی کی کمائی میں برکت:

مسمات پچھی ایک بیوہ عورت تھی، وہ تمام روز رسّی کے پٹّے بانٹ کر شام کو بازار میں فروخت کر کے اپنی گزر اوقات کرتی تھی۔ اپنی سارے دن کی اس کمائی میں سے ایک دمڑی شیخ کی خدمت میں بطور نذر پیش کر دیتی تھی۔ اسی طرح کافی عرصہ گزر گیا۔ ایک روز مذکورہ خاتون صحرا میں فراغت کی غرض سے بیٹھی تھی کہ گرہ لگا کپڑے کا ایک ٹکرا پڑا ہوا دیکھا۔ جب اسے اٹھا کر کھولا تو کیا دیکھتی ہے کہ اس میں نو سو سات دمڑیاں ہیں۔ وہ خوش ہو گئی اور اسے گھر میں لا کر سنبھال رکھا۔ دوسرے دن حسب معمول پھر رسّی کے پٹّے فروخت کر کے ایک دمڑی شیخ کی خدمت میں نذر کو لائی۔ شیخ نے اسے دیکھتے ہی تبسم فرمایا اور کہا" ماتا پچھی! اس غریب دولا فقیر نے کل بمشکل، ہزار حیلوں سے تمہارا پچھلا قرض چکایا ہے، اب نئے سرے سے اس قرض کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے وہ دمڑی قطعی قبول نہ کی اور اسے تبرک دے کر رخصت کر دیا۔ پچھی نے جب گھر آ کر وہ رقم گنی تو اسے پتا چلا کہ یہ وہی نو سو سات دمڑیاں ہیں جو وہ وقتاً فوقتاً شیخ کی خدمت میں پیش کرتی رہی تھی۔ وہ الٹے پاؤں شیخ کے حضور آئی اور دامن گیر ہو کے التجا کی کہ یا حضرت! میں نے جس قدر نذر دی، وصول کر لی، لیکن میرا وہ سودا" دس دنیا میں اور ستر آخرت میں"، کی امید پر تھا۔ اگرچہ اب اخروی اجر کی آس تو ختم ہو گئی لیکن جو منافع اس دنیا میں بنتا ہے، وہ میرے حوالے فرمائیں تا کہ آپ پہ عائد میرا قرض ساقط ہو، بصورت دیگر آپ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑوں گی۔ شیخ اس عورت کی یہ ناز بھری گفتگو سن کے مسکرائے اور فرمایا، اے دوستو! ایسا شوخ نظر اور سخی

طلب قرض خواہ میں نے اس سے قبل نہیں دیکھا تھا۔ ماتا پچھی، تو اپنے گھر جا اور چرخہ کات۔ اسی کام سے تم دنیا کا دس فیصد پالوگی۔

پچھی کہتی ہے شیخ کے فرمان کے مطابق میرے کاتنے کے اس کام میں اس قدر برکت ہوئی کہ اگر میں روئی کا ایک گالا ہاتھ میں لے کر کاتتی تو سات گالوں کے برابر دھاگے تکلے پر جمع ہو جاتے اور جب میں اس سے پٹہ بنا کر بازار لے جاتی تھی تو ان کا وزن پہلے کی نسبت آٹھ گنا زیادہ ہوتا تھا اور اسی کمائی سے میں مختصر عرصے میں مال دار ہوگئی اور اسی روپے سے میں نے ایک بیٹے کی شادی اور دو بیٹیوں کے ہاتھ بھی پیلے کیے اور اپنی باقی ماندہ زندگی آرام و آسایش سے بسر کی۔

شیخ دولا کی اشاراتی گفتگو اور کشف القلوب:

سعادت اساس رمز شناسوں اور عقل و قیاس کے اضافت پسندوں پر واضح ہے کہ شیخ کشف القلوب کے معاملے میں اس قدر تیز فہم تھے کہ اگر کوئی اپنے گھر سے دل میں کوئی آرزو لیے ان کے حضور آنے کا قصد کرتا اور آپ کے سامنے آتا تو آپ اس کے اظہار مدعا سے پہلے ہی رمز و اشارات میں اسے جواب سے نواز دیتے۔ لیکن اس رمز و کنایہ کو سمجھنے کے لیے زود فہم اور سریع الادراک لوگ ہی درکار تھے۔ چنانچہ:

چوہدری بیگ کی وفات:

چوہدری عیسیٰ بیان کرتے ہیں کہ میرے والد چوہدری بیگ کو بخار ہوگیا تو مجھے کہا کہ شیخ کی خدمت میں جاؤ اور میرے لیے صحت کی درخواست کرو۔ جونہی میں شیخ کی خدمت میں پہنچا اور آداب بجالایا۔ ابھی عرض مدعا بھی نہ کر پایا تھا کہ شیخ نے اپنا دست مبارک میرے سر پر رکھتے ہوئے فرمایا: ''بابا عیسیٰ! باپ کی دستار تمہارے سر پر مبارک ہو۔'' میں یہ اشارہ قطعاً نہ سمجھ سکا اور اپنے والد کی کیفیت سے انھیں آگاہ کیا۔ لیکن آپ اغماض برتتے ہوئے دوسری جانب متوجہ ہو گئے اور کوئی جواب نہ دیا۔ چنانچہ میں مایوس ہو کر گھر واپس لوٹا۔ والد صاحب میرے منتظر تھے، انھوں نے پوچھا کہ شیخ نے کیا کہا؟ میں نے انھیں بتایا کہ انھوں نے پہلے تو ایسا کہا اور اس کے بعد میری درخواست پر بے توجہی برتی۔ یہ سنتے ہی والد صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور کہہ اٹھے: ''افسوس اس زندگی پر، اے جان پدر! شیخ نے جواب دیا ہے، لیکن تو اسے سمجھنے سے قاصر رہا ہے۔ باپ کی دستار بیٹے کے سر پر اس وقت مبارک ہوتی ہے جب باپ اس دنیائے فانی

سے کوچ کر جاتا ہے، اور میں اب یہ جان گیا ہوں کہ میری مہلت عمر تمام ہو چکی ہے، لہذا اب میرے علاج کی سعی ترک کر دو اور مجھے خدا کے حوالے سونپتے ہوئے اپنے فرائض کی ادائیگی سے عہدہ برا ہو۔" اس کے تین دن بعد چوہدری بیگ کا انتقال ہو گیا۔

حاکم گجرات مرزا بدیع الزمان کا قتل:

چوہدری عیسیٰ کہتے ہیں کہ ہم حاکم گجرات مرزا بدیع الزمان کے ظلم وستم سے تنگ آ گئے تھے۔ ایک دن دل میں یہ شکایت لے کر میں شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ قبل اس کے کہ صورت حال بیان کرتا، ایک شخص، بڑے، کچوری اور پاپڑ نذر کی غرض سے لے کر آیا۔ شیخ میری جانب متوجہ ہو کر گویا ہوئے: "بابا عیسیٰ! اب چاول اور یخنی سے ہماری طبیعت اکتا گئی ہے، بڑے، کچوری اور پاپڑ کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔ یہ لے اور کھا، کہ تیرے لیے نیک شگون ہے۔" میں نے آداب بجالاتے ہوئے ان کے دست مبارک سے مذکورہ اشیا لے کر تناول کیں اور پھر کسی قسم کا اظہار مدعا نہ کیا۔ کیونکہ میں شیخ کی یہ اشاراتی گفتگو سمجھ گیا تھا۔ اس کنایہ کا مطلب یہ تھا کہ چاول اور یخنی مغلیہ کھانے ہیں، یعنی ہم مغل حکمران نہیں چاہتے۔ بڑے اور کچوری ہندی غذائیں ہیں، اس کا مطلب یہ تھا کہ اب اس جگہ ہندو حاکم تخت نشین ہو گا۔ اس واقعہ کے ٹھیک ایک ماہ بعد بدیع الزمان، شیخ عارف کے ہاتھوں مارا گیا اور اس کی جگہ راجہ کھنور گجرات کا حاکم بنا۔

شیخ دولا کی منشی شیخ محمد رشید کو نصیحت:

شیخ محمد رشید، جو حاکم اٹک داور داد خان کا معتمد اور معتبر منشی تھا، مذکورہ خان کی اجازت سے اپنے وطن آیا، کچھ عرصہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ بسر کرنے کے بعد واپسی کا قصد کیا اور شیخ کی خدمت میں آ کر رخصت چاہی۔ شیخ نے کہا کہ بابا رشیدا! ہم نہیں چاہتے کہ تجھے خود سے جدا کریں۔ بہتر ہے کہ تم چند روز مزید اپنے گھر میں گذار لو۔ محمد رشید نے التماس کی کہ یا حضرت نوکری کا معاملہ ہے، مالک کی رضامندی کے مطابق جانا ہی مناسب ہے۔ شیخ نے رشید کا ہاتھ مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں تھاما، اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور زعفران کے چند پودے، جو کسی شخص نے کشمیر سے لا کر خانقاہ کے صحن میں لگائے تھے اور بہت تر و تازہ نظر آ رہے تھے، ہاتھ بڑھا کر انہیں جڑ سے اکھاڑ ڈالا اور محمد رشید سے مخاطب ہوئے: "بابا رشیدا! اب ہمارا دل زعفران دیکھنے کو نہیں چاہ رہا، ہم یہاں پیاز کاشت کریں گے۔ اس رمز شناس اور زبان دان شخص نے رخصتی

کا ارادہ ترک کیا اور گھر آن بیٹھا۔ بیس روز کے بعد خبر ملی کہ داور داد خان اس جہان فانی کو خیر باد کہہ گیا ہے اور معلوم ہو گیا کہ شیخ کا اشارہ اسی طرف تھا۔ بالفرض اگر اس کے وہاں جانے کے بعد داور داد خان کی وفات ہوتی تو اسے پوچھ گچھ کا سامنا کرنا پڑتا اور اللہ جانتا ہے اس حساب دہی میں اس کی عزت و تعظیم رہتی یا نہ؟ جب گھر میں رہا تو کنارے پر رہا۔

ملاقات ملا عبدالحکیم سیالکوٹی و شیخ دولا:

جدید وقدیم علوم کے واقف، مولوی عبدالحکیم نوّر مرقدہ اکثر شیخ کی زیارت کے لیے سیال کوٹ سے گجرات آیا کرتے اور اللہ کے یہ دونوں بزرگ چند روز باہمی گفت و شنید میں گذارتے۔ ان دنوں جب کہ شاہ جہان بادشاہ کے بیٹوں، یعنی اورنگ زیب، داراشکوہ، شجاع اور مراد کے مابین تخت حاصل کرنے پر جنگ ہو رہی تھی، اور بادشاہی جاہ وجلال ختم ہو چکا تھا، تمام ملک کے امن و امان میں اس قدر خلل وفساد پیدا ہوا کہ کئی علاقے تباہ ہو گئے۔ خصوصاً کوہ جموں کی طرف کے لشکر سے سیال کوٹ شہر اور اس کے گرد ونواح کے ساکنین میں شدید خوف و خطر پھیل گیا۔ سب لوگ ترک وطن کر کے دشمن کی پہنچ سے دور محفوظ مقامات پر چلے گئے۔ مولوی بھی فرمان الٰہی **ولا تلقوا باید کم الی التھلکہ** [بقرہ، ۱۹۵] پر کاربند رہتے ہوئے قصبہ سوہدرہ آئے اور اپنے اہل وعیال کو یہاں چھوڑ کر خود گجرات پہنچے اور چند روز شیخ کے ہاں رونق افروز رہے۔

کیونکہ طبقہ علماء کے پاس ہر بات کرنے کے لیے بے شمار تاویلات، دلائل، حجتیں اور اقوال ہوتے ہیں، ایک روز مولوی نے اپنے طور پر اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ میں دن اور رات کے آٹھوں پہر، کبھی بھی شیخ کو عوام میں گھرا، سخاوت، فیاضی، کارخانوں کی خبرداری، تعمیراتی اہتمام، مزدوروں اور دیگر متعلقین کی احوال پرسی اور مہمانوں کی خاطر مدارت سے فارغ نہیں دیکھتا، ذکر حق میں کس وقت مشغول ہوتے ہیں؟ اس کے بعد جب مولوی صاحب شیخ کی خدمت میں آکر بیٹھے اور مختلف موضوعات پر بات سے بات نکلتی گئی، تو مولوی صاحب نے کہا: شیخ جیو، کیوں نہ ہم ایک دوسرے کی رفاقت میں حج کو چلیں اور خانہ خدا کی زیارت کریں۔ شیخ نے ہنستے ہوئے وہ گدڑی، جسے زمین پر بچھا کر بیٹھے ہوئے تھے، اٹھا کر کندھوں پہ ڈالی اور اٹھ کھڑے ہوئے اور مولوی صاحب کا بازو پکڑ کر فرمایا کہ مولوی صاحب آپ ہی کے بزرگوں سے یہ مسئلہ سنا ہے کہ جس عمل سے شر کا خطرہ ہو، اسے ترک کر دینا چاہیے، شاید کہ اس توقف سے شر کا وہ اندیشہ، خیر میں بدل جائے اور

جیسے ہی کوئی نیک خیال دل میں پیدا ہو، اس پر فوراً ہی عمل کر لینا چاہیے، مبادا تاخیر سے نفس مکارہ اور فریب دینے والا شیطان اس شخص کو ورغلا کر پھر سے شر کی جانب مائل کر دے۔ لہٰذا اگر یہ نیک خیال آپ کے ذہن میں آیا ہے تو اس پر عمل کرنے میں غفلت برتنا مناسب نہیں بلکہ بہتر تو یہ ہوگا کہ اس کام کو کل پر نہ اٹھا رکھیں اور ابھی اسی لمحے ہم خانۂ خدا کو روانہ ہو جائیں۔ وگرنہ فریضۂ حج کی سعادت کے حصول کے بعد دوبارہ اس ملک کی جانب دوڑنا اور میرا لوگوں سے شکر وشیرینی اکٹھا کرنا اور تیرا بادشاہی پیش اماموں سے محصول جمع کرنے میں لگ جانا، گویا اپنے حج کو عیب دار کرنا ہے۔ اس صورت میں آسمان اور زمین کے پاک باز علماء لعن وطعن کریں گے کہ یہ ناپاک لوگ جس ناپاکی کے عالم میں خانۂ خدا گئے تھے، ویسے ہی ناپاک واپس لوٹ آئے ہیں۔

مولوی صاحب نے کہا شیخ جیو، یہ فرض ادا کرنے کے لیے زادِ راہ کا انتظام کرنا اور اپنے اہل وعیال کی رضامندی کا حصول شرط ہے۔ ابھی اسی ساعت اس دور دراز سفر کے لیے روانگی کس طرح ممکن ہے؟ شیخ نے جواب دیا مولوی صاحب، خدا کی یاد کا خلاصہ تو یہی ہے کہ خواہ ہزاروں علائق ہوں، دل دنیا و مافیہا کی محبت سے کنارہ کشی اختیار کر لے، نہ یہ کہ زبان توبہ واستغفار میں مشغول ہو اور دل ہزاروں دنیاوی معاملات میں الجھا ہوا ہو۔ اگر تو خاکساری کے راستے میں بیٹھا ہے تو خاک کی طرح ہر بے سروسامان کا پائمال ہو جا، زبان پر حرفِ شکایت مت لا، زبان سے کچھ نہ بول۔ اور اگر اٹھنا چاہتا ہے تو ہوا کی مانند آزاد اڑ اور مجرّد (تنہا) رہ اور نام ونشان مت تلاش کر۔ یہاں زہد واطاعت سے مراد اپنے آپ سے الگ ہونا اور بے تعلقی کی دنیا سے جڑنا اور حق کے سوا کسی سے دل نہ لگانا ہے۔

ان اللہ لا ینظر الی صورکم و اعمالکم ولکن ینظر الی قلوبکم و نیاتکم [خدا تمہاری صورتوں اور عملوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں اور نیتوں کو دیکھتا ہے۔ **مشکوۃ، باب الریا والسمعتہ،** ص ۴۵۴]

مولوی صاحب یہ بات سن کر کھڑے کے کھڑے ہی رہ گئے اور کوئی جواب نہ بن پڑا۔ جب اپنے گھر گئے تو اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اے دوستو! آج مجھے شیخ کے سامنے بہت شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا اور مجھ میں اتنی تاب بھی نہ رہی کہ کوئی جواب دے سکوں۔ میں نے ان کی غیر موجودگی میں کہا تھا کہ شیخ ان دنیاوی علائق میں الجھے رہتے ہیں، بھلا خدا کو کب یاد کرتے

ہیں؟ تم نے سنا کہ انھوں نے کیا جواب دیا؟ مجھے یقین ہے کہ کشف القلوب کے معاملے میں شیخ سے بڑھ کر کوئی سریع الفہم ولی اس زمانے میں نہیں ہوگا۔

واقعہ وفات ملا عبدالحکیم سیالکوٹی:

دوسرے دن جب مولوی صاحب شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو محبت آمیز باتیں ہونے لگیں۔ شیخ نے ان سے پوچھا کہ مولوی صاحب! آپ کے والد بزرگوار میاں شمس الدین کی قبر کہاں واقع ہے؟ مولوی نے کہا کہ شیخ جیو، آپ بارہا اس قبر کی زیارت کو گئے ہیں۔ ایسا کیا ہوا کہ اب فراموش کر دیا؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ ان کی قبر سیال کوٹ میں ہے؟ شیخ نے فرمایا، ہاں، ہم بھول گئے تھے، لیکن آپ کے لیے مناسب ہے کہ جلد از جلد سیال کوٹ چلے جائیں اور اپنے والد بزرگوار کے مزار سے علیحدہ نہ ہوں۔ مولوی صاحب خدا کے درویشوں اور رمز شناسوں کی زبان سے نکلنے والے ان الفاظ، "من احبا قوماً فھو منه" ["من تشبه بقوم فھو منھم" تفسیر ابوداود، کتاب اللباس] کے مصداق درویشوں کے اس سرحلقہ کے کلام سے سمجھ گئے کہ شیخ کا مدّعا کیا ہے اور اس سے اغماض برتنا، گویا نقصان و ہزیمت کا سامنا کرنا ہے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میں زندگی میں متعدد بار شیخ کی خدمت میں آتا جاتا رہا ہوں، لیکن اس طرح کبھی رخصت پر آمادہ نہیں ہوئے۔ میں جانتا ہوں کہ میری خواہش کے بغیر مجھے رخصت کرنا خالی از حکمت نہیں ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ ان کے پیش نظر کیا صورت حال ہے۔

الغرض مولوی اسی وقت شیخ سے رخصت ہو کر قصبہ سوہدرہ گئے اور وہاں سے اپنے تمام متعلقین اور ساتھیوں کو ہمراہ لے کر سیال کوٹ پہنچے۔ خدا کی قدرت کہ جیسے ہی وہ سیال کوٹ پہنچے، انھیں اسہال اور بخار نے آن لیا۔ اگرچہ ماہر اطباء بغرض علاج حاضر ہوئے، لیکن مولوی صاحب ہرگز آمادہ نہ ہوئے اور فرماتے تھے کہ شیخ کی خدا حافظی اور کنایاتی گفتگو سے مجھے پتا چل چکا ہے کہ رشتۂ زندگانی منقطع ہو چکا ہے، لہٰذا خواہ مخواہ دوا کھا کر کیوں اپنا حلق کڑوا کیا جائے؟ اس کے سولہ دن بعد اس جہان فانی سے عالم جاودانی کی جانب رحلت فرمائی اور اپنی ہمہ گیر اور ہمہ جہت زندگی کا علمی ورثہ، نکتہ رسی، فصاحت و بلاغت، اپنی حیات سرمدی کے نمونے کے طور پر زمانے میں چھوڑ گئے۔ چنانچہ ایک رند نے مولوی کی تاریخ وفات کہی ہے "میاں دن تن ستّا" = ۱۰۶۶ اور یہ مشہور ہے، لیکن استاد مولانا [عبدالرحمان] جامی نے بڑا اچھا قطعۂ تاریخ کہا ہے جو

اس مولانا مرحوم و مغفور کے احوال کے عین مطابق ہے۔

قطعۂ تاریخ وفات ملا عبدالحکیم سیالکوٹی:

روح پاک مولوی عبدالحکیم افسوس و آہ
ملک الا اللہ خوش کرد از جہان لا الہ
کی بر آید چون تو دانشمند بر روی زمین
آسمان گر بر زمین سر می زند تا چند گاہ
از برای ماتم تو می سزد تا روز حشر
گر کلاہ افگندہ بینم از سر خورشید را
حسرت تاریخ و آنکہ بہر تاریخ دگر
"گہ بمدرسہ آیم و گاہ می روم در خانقاہ"

۱۶۷۶

[اس مادہ کے اعداد ملا عبدالحکیم کی قمری تاریخ وفات کے مطابق نہیں ہیں۔ مترجم]

سید محمد فاضل گجراتی اور شیخ دولا کے باہمی تعلق کی حقیقت:

بعض منکرانِ طریقت اور منحرفانِ حقیقت اپنی فطرت میں چھپے درونی حسد اور باطنی خباثت کے باعث فقط اپنے انکار کی رونق گفتار کے لیے، غلط حجت اور بھونڈی دلیل پیش کرتے ہیں کہ سید محمد فاضل، شیخ کے احوال و اقوال کے منکر تھے اور ان سے عداوت رکھتے تھے۔ ان کی یہ سب باتیں محض بہتان طرازی اور سراسر مخالفت پر مبنی ہیں۔ راست باز اہل دل کے آستانے کے اس خاکروب نے جو کچھ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا، بے کم و کاست انصاف پسندوں کے حضور سامنے بیان کر رہا ہے کہ در حقیقت محمد فاضل، میدان شرع کے بہادر، اصل و فرع پر حاوی، صاحب علم و فضل، متوکل کامل، اہل تقوی و عمل، سید النسل، نجیب الاصل، عالم عامل، مستغنی بالذات، راستی پسند اور راست کردار تھے۔ "خدا کے لیے محبت اور خدا کے لیے بغض" اپنا شعار بنائے رکھا۔ اور ساری نیت نیکی کو فروغ دینے اور فوز و فلاح کو ظاہر کرنے، سنت و جماعت کے احکام جاری کرنے کی تھی۔ اس کام میں ان کی غیر معمولی احتیاط اور ممکنہ مساعی کا نتیجہ تھا کہ دوابہ چناب اور بست میں کسی کو فسق و فجور اور منہیات کے ارتکاب کی جرات نہیں ہوتی تھی

اور آپ کے وجود شریف کی وجہ سے بدعات و محرمات بالکل ختم اور حرام یا ممنوعہ اعمال اور لہو و لعب کلی طور پر نیست و نابود ہو گئے تھے۔ شریعت کا شکوہ و تمکنت، بے لوث استقامت اور استغنا ان کی نورانی پیشانی پر اس طرح سے جلوہ گر تھا کہ امراء و خوانین، اور غنی و مساکین، کسی کو ان کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ بلکہ یہ لوگ جب کبھی ان کی خدمت میں آتے، ان کی پیشانی کا رنگ اڑا ہوا ہوتا تھا اور اکثر دولت مند فلسفی محض ان کی مجلس میں جگہ پانے اور بات کا بہانہ تلاش کرنے کی غرض سے نقد نذرانے اور اجناس لے کر آتے اور چاپلوسی اور خوشامد کرتے تھے۔ لیکن وہ ہرگز قبول نہ کرتے، اس فعل کو مکروہ گردانتے اور دنیاداروں اور ارباب حکومت کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور ان کی عزت و تکریم نہ کرتے تھے۔ بادشاہ اورنگ زیب ان کے تقوی، سچائی اور شرعی استقلال کے باعث ان کا سچا معتقد تھا اور ان کے کہے اور لکھے پر بغیر کسی تاخیر کے، عمل بجا لاتا تھا۔ اس قدر و منزلت کے باوجود، کہ تمام دولت مند افراد ان کی چوکھٹ کی ڈھول تھے، ان کے گھر سے کبھی فقر و فاقہ رخصت نہ ہوا اور ان کے اہل خانہ پر دو دو، تین تین وقت کا فاقہ گذرتا تھا۔ کشادگی رزق آمدن سے ہوتی ہے اور جب آمدن کے سب ذرائع ہی مسدود ہوں تو آسمان کس طرح وفا کرے اور فراخی رزق کس طور رونما ہو؟ درحقیقت اگر یہ احقر اس مبارک ہستی کی زندگی کا ایک ایک متبرک قصہ تفصیلاً لکھے تو اس کے لیے ایک الگ کتاب درکار ہے، تاکہ اس بیان کا حق ادا ہو سکے۔ لہذا اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف ضروری باتیں ہی بیان کی جا رہی ہیں کہ سید محمد فاضل مذکور کا شیخ سے باپ اور بیٹے جیسا رشتہ و تعلق تھا۔ شیخ جب نماز جمعہ کے لیے سیّد کی جامع مسجد جاتے تھے، تو سیّد ان کا آداب تعظیم و تکریم بجا لاتے تھے اور ان کے حضور و غیاب میں کہتے تھے کہ شیخ میرے لیے والد کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ اوائل شباب میں [ان کے والد؟] سید احمد بطور سیاح گجرات آئے تھے اور اپنا وطن احمد آباد بتاتے تھے لیکن کسی سے شناسائی نہ تھی۔ غریبانہ گذر اوقات کر رہے تھے۔ شیخ نے ان کے آرام اور نماز کے لیے ایک حجرہ اور ایک مسجد تعمیر کر کے دے دی۔ اور ہر لحاظ سے ان کا خیال رکھتے تھے۔ بعد ازیں سید احمد نے شادی کر لی۔ اگرچہ محلّے کے لوہار بھی ان کی تھوڑی بہت خدمت بجا لاتے تھے لیکن ان کے طعام، لباس، صابن، تیل اور دیگر ضروریات کا خیال رکھنا مکمل طور پر شیخ کی ذمہ داری تھا۔ جب کچھ مدت اسی طرح گذر گئی تو سید احمد نے سفر حج کا قصد کیا اور جملہ اہل خانہ کو ساتھ

لیا۔ شیخ نے زادِ راہ کے تمام اسباب مہیا کر دیے۔ سوائے مولوی عبدالحکیم کے، جنھوں نے ان کی سواری کے لیے ایک اونٹ بھیجا، کسی اور مال دار یا صاحب ثروت فرد نے ان کی کوئی مدد اور معاونت نہ کی۔

سید احمد نے اپنی منزل مقصود، یعنی کعبہ تک پہنچنے سے پہلے ہی بصرہ کے مقام پر سفر آخرت اختیار کر لیا اور بوقت رحلت، سید فاضل کو وصیت کی کہ اے فرزند! جب حج کی سعادت کے حصول کے بعد اپنے وطن واپس جاؤ گے تو شیخ کو میری جگہ تصور کرتے ہوئے ان کے حفظ ادب اور تعظیم و تکریم میں، اور ان کی خوشنودی اور رضامندی کے حصول میں، کسی بھی طرح سے خود کو معاف اور معذور نہ سمجھنا۔ اس کے بعد جب سید فاضل سعادت حج کے حصول کے بعد گجرات واپس آئے تو شیخ بدستور ان کی گذراوقات کے لیے خبر گیری کرتے تھے۔ سید بھی پدرانہ حرمت و عزت سے شیخ کا ادب و احترام بجالاتے تھے اور ان دونوں بزرگوں کی تمام عمر اسی طور سے گذری۔ اور اگر کوئی اپنی پست فطرتی اور بدظنی کے باعث شیخ کے متعلق، سید کے حضور کوئی بے ادبی کرتا تھا تو وہ خوب سمجھتے تھے اور اس کو اپنی مجلس سے نکال دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ تمام استغراق، مراقبہ اور جذب و سرور، جو ہم شیخ کی ذات میں دیکھتے ہیں، اس زمانے کے کسی درویش میں نظر نہیں آتا۔ ہم اور آپ ہنوز تعلقِ دنیا کے نشے میں سرشار ہیں، ہمیں کیا حق ہے کہ عالم توحید کے ان راہروں کے بارے میں ردّ و قبول کی بات کریں۔

جس روز شیخ اس جہان سے ملک عدم کو روانہ ہوئے، سید نے اپنے ہاتھوں سے غسل اور تجہیز و تکفین کی رسوم ادا کیں اور وہ تابوت جس میں شیخ کی میت رکھی تھی، اس کا ایک پایہ سید کے کندھوں پر اور بقیہ تین پایے دوسرے لوگوں نے اپنے سر اور کندھوں پر اٹھائے اور مسجد عید گاہ تک لے گئے۔ سید نے نماز جنازہ کی امامت کی اور دیگر خلق مقتدی تھی۔ نماز جنازہ پڑھنے کے بعد اسی طرح صندوق کو اپنے سر اور کندھوں پر اٹھا کر اپنے ہاتھ سے لحد میں اتارا اور مٹی ڈالنے تک قبر پر کھڑے رہے۔ بعدازاں دعائے مغفرت پڑھی۔ ان کی آنکھوں سے اشک جاری تھے اور کہتے تھے کہ میری پرورش اور تربیت کے سلسلے میں شیخ کا جو احسان مجھ پر ہے، وہ ایسا نہیں کہ اس کا شمار کر سکوں۔ آج میں نے جان لیا کہ شفقت پدری کا سایہ میرے سر سے اٹھ گیا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ سید اور شیخ کی مہر و محبت کا قصہ اور ان دونوں برگزیدہ ہستیوں کے مابین

ہونے والے بعض ظریفانہ اقوال اور خوش طبعیوں کی تفصیل موجب طوالت ہے اور اگر ان واقعات کو یہاں بیان کیا جائے تو بات لمبی ہو جائے گی۔ خدانہ کرے کہ میں فقط زیب داستان کے لیے من گھڑت واقعات بیان کروں، صرف وہ جو ضروری ہوں گے، یہاں بیان کیے جائیں گے۔

سید جواد بخاری فوجدار گجرات:

سید جواد بخاری جب بادشاہ وقت کی طرف سے ضلع گجرات کے فوج دار متعین ہوئے تو ایک خستہ حال بوڑھا ہاتھی اپنے حکومتی طمطراق کی غرض سے ہمراہ لے آئے۔ جتنا عرصہ وہ برسر حکومت رہے ہاتھی کو چارہ ملتا رہا۔ معزول ہونے کے بعد اس کے اخراجات سے عاجز آ گئے اور اسی مال کو (ہاتھی پر خرچ کرنے کی بجائے) ہندوستان لے جانا زیادہ نفع بخش معلوم ہوا، لہٰذا ہاتھی شیخ کی خدمت میں لا کر بطور نذرانہ پیش کر دیا۔ شیخ نے فرمایا کہ امام جیو! ایک تو دولا خود کمزور اور دوسرا ہاتھی ضعیف۔ دونوں ایک گھر میں نہیں سما سکتے، آپ کو چاہیے کہ جس راہ سے اسے لائے ہیں، اسی سے واپس لے جائیں۔ جب سید جواد نے دیکھا کہ شیخ نے ہاتھی کو قبول نہیں کیا اور ہمراہ لے جانا بھی مشکل ہے تو ناچار اسے شہر کے باہر چھوڑ کر خود روانہ ہو گئے۔

چند روز بعد خبر ملی کہ سید جواد کا ہاتھی شہر کے گرد آوارہ اور آزادانہ گھوم رہا ہے اور بھوک سے مرنے کے قریب ہے۔ شیخ نے حکم دیا کہ اسے ان کے پاس لایا جائے۔ ایک فیل بان اس کی دیکھ بھال کے لیے مقرر کر دیا۔ ہاتھی کو ''باباگنیش'' کا خطاب ملا اور پل سے متصل ایک جگہ اس کے لیے بطور اصطبل مقرر ہوئی۔ شیخ ہر روز اسے دیکھنے کو آتے تھے اور ایک دو گھنٹے وہاں قیام فرماتے اور اس وقت جو نذر نیاز بھی آتی تھی وہ باباگنیش کا نصیب تھی۔ درست طور پر اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ کتنی مقدار میں شکر، شیرینی اور متفرق چیزیں کھاتا تھا لیکن یہ مقدار تین چار من سے کم بہر حال نہیں ہوتی ہو گی۔ کچھ ہی دنوں میں ہاتھی فربہ اور تندرست ہو گیا۔

ایک دن فیل بان اسے پانی پلانے کی غرض سے شہر سے باہر لے جا رہا تھا۔ سید عبدالباقی نے، جو کہ اپنی قوم اور قبیلہ سے ناراض ہو کر اپنے آبائی وطن سے گجرات آ بسے تھے اور شیخ کی خانقاہ سے متصل مسجد اور حویلی کی تعمیر کے لیے کوشاں تھے، لیکن نیت یہ تھی کہ خلق خدا کو تنگ کر کے اپنی عزت و احترام کی دھاک بٹھائیں، اپنے شاگردوں سے کہا کہ ہم اس جگہ کتابوں کا درس

دیتے ہیں اور یہ بہانہ خور فیل بان اس راستے پر ہر روز بے ادبی سے آتا جاتا ہے۔ خبردار! اس کی تنبیہ و تادیب کی جائے۔ تمام شاگردوں نے اینٹیں، ڈھیلے اور پتھر اٹھا کر اس کی جانب پھینکے۔ اگرچہ ہاتھی کو کوئی نقصان نہ پہنچا لیکن فیل بان شدید زخمی ہو گیا۔ وہ جلدی سے ہاتھی کو چلا کر لے گیا اور شیخ کے پاس آ کر فریاد کی۔ شیخ نے سن کر اغماض برتا۔ اس نے دوبارہ فریاد کی، لیکن وہ پھر بھی متوجہ نہ ہوئے۔ جب تیسری مرتبہ واویلا کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اے بابا خاموش رہ۔ وہ علما، جن کا ہزار کوس دور سے بھی ادب واجب ہے، ہمارے ہمسائے ہو گئے ہیں، وہ جو کریں، کرنے دو۔ جاؤ اور اپنے کام میں مشغول رہو اور کوئی گستاخانہ کلمہ منہ سے مت نکالو۔

دوسرے روز شیخ نے سید عبدالباقی کے مسکن کا رخ کیا۔ آپ کے آستانے سے ان کے گھر تک تقریباً دو تیر پھینکنے کا فاصلہ ہو گا۔ جاتے جاتے راستے میں دو تھیلے شکر، گل شکر اور میوہ جات بغرض نذر جمع ہوئے۔ جب سید کو شیخ کی آمد کی اطلاع ملی فوراً استقبال کو آئے اور تمام تر تعظیم کے ساتھ انہیں اپنے گھر لے گئے۔ شیخ نے وہ شیرینی بطور تبرک پیش کی اور فرمایا کہ امام جیو! میری آمد کا مقصد بزرگوں کا دیدار ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ مسجد اور آپ کے حجروں کی تعمیر کا نقشہ دیکھوں۔

سید نے شیخ کا ہاتھ پکڑ کر انہیں تمام جگہیں دکھائیں۔ شیخ نے کہا امام جیو! اس بوڑھے دادا کو بھی اپنی اس مسجد کی تعمیر کے اخراجات میں شریک کر لیں۔ سید نے کہا شیخ جیو! ہمارے پاس اس قدر سرمایہ موجود ہے جو اس عمارت کی تعمیر کے لیے کافی ثابت ہو، پھر آپ کو کیوں زحمت دی جائے؟

شیخ نے فرمایا یہ مسئلہ آپ جیسے بزرگوں سے ہی سنا ہے کہ روز حشر جب اُس پل پر سے گذرنا ہو گا جو تیز دھار تلوار سے زیادہ تیز، بال سے زیادہ باریک اور کسی ظالم بدخو سے زیادہ خوفناک و مہیب ہے، وہ لوگ جنھوں نے اپنے مال سے مساجد تعمیر کیں اور وہ جنھوں نے ان عمارات کی تعمیر میں خواہ ایک اینٹ یا مٹھی بھر مٹی سے معاونت کی ہو گی، یہ مساجد کشتی کی مانند انھیں اپنے اوپر بٹھا کر تمام آفات اور خوف وخطر سے محفوظ، امن وسلامتی کے ساتھ یہ پل عبور کروا دیں گی۔ لہٰذا یہ بوڑھا غلام بھی چاہتا ہے کہ ائمہ مساجد کی کشتی میں بیٹھ کر اس خطرناک طوفان سے امن و امان اور سلامتی سے گذرے۔

یہ بات سن کر سید راضی ہو گئے، چنانچہ شیخ بیس مزدور اور ایک روپیہ نقد روزانہ وہاں کے

اخراجات کے لیے اپنی جانب سے مقرر کر کے اپنے آستانے کو واپس لوٹ گئے۔ اسی وقت فیل بان نے آ کر پھر فریاد کی کہ حضرت سلامت! وہ لوگ جو اس آستانے کے متعلقین کو ستاتے ہیں اور ان کی بے عزتی کرتے ہیں، حضرت ان کے ساتھ اس طرح نرمی اور دلاسے کا سلوک فرماتے ہیں۔ اب میں جان چکا ہوں کہ یہاں ہم جیسے لوگوں کی جگہ نہیں ہے۔ امید ہے کہ مجھے پروانہ آزادی مل جائے گا۔

شیخ نے فیل بان کو اپنے قریب بلایا اور کہا اے بھائی! آج میرا سیّد کے گھر جانا محض تیرے انتقام کی غرض سے تھا۔ چنانچہ ہم نے ان کے گھر جا کر ان سے جنگ کی ہے۔ ان کی طرف سے سنگ ہماری جانب آئے اور ہماری طرف سے سلامتی کی روٹی ان کی طرف ماری گئی۔ بالآخر ہماری روٹی کے احسان کا زخم اس کی جان پر زیادہ کاری ثابت ہوا اور ان کے بھاری پتھروں نے ہم پر کوئی اثر نہ کیا۔ اس صورت میں ہم کامیاب و فتح یاب قرار پائے اور وہ شکست خوردہ ٹھہرے۔ ہم سیّد کو احسان کے نان سے اس طرح عاجز اور سرنگوں کر آئے ہیں کہ اب اگر تو دس ہاتھیوں پر بھی سوار ہو کر وہاں جائے گا تو اس کا سر ہرگز اوپر نہیں اٹھے گا۔

ہاں جی! سرورِ عالم، مقتدائے اولادِ آدم حضرت محمد ﷺ کے اس حکم کے مطابق کہ آپؐ نے فرمایا ہے "تواضع اور احسان کا شیوہ دوستوں کے دل میں دوستی کی قدر و قیمت کو بڑھاتا ہے، دشمنوں کے سینے سے دشمنی کی کدورت کو ختم کرتا ہے اور بیگانگی کے جذبات کو یگانگی میں بدلتا ہے۔" امام خاقانی اپنے آپ سے کہتے ہیں جیسے کہ دشمنوں کو، جیسے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے خود سے دشمنوں کو دور کیا تھا، ہمیں بھی ویسا ہی کرنا چاہیے۔

سرشان ببر ز خلق شکر چون مصطفی

کافگند زیر پای ابوجہل طیلسان

قلندر کی دشنام طرازی اور شیخ دولا کا وسعتِ ظرف:

ایک روز ایک قلندر آیا اور شیخ سے تازہ انگور اور سونے کی دو اشرفیاں طلب کیں۔ آپ نے فرمایا کہ بیٹھ جاؤ اور آرام کرو، خدا دے گا۔ اس منہ پھٹ نے گالیاں دینی شروع کر دیں اور اس حد تک نازیبا گفتگو کی کہ حاضرینِ مجلس میں سننے کی تاب نہ رہی، لیکن شیخ کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے اسے کوئی سزا نہ دے سکے۔ نصف روز تک یہی صورت حال درپیش رہی، لیکن شیخ نے اس کی ہرزہ

سرائی اور بیہودہ گوئی پر قطعاً کان نہ دھرے اور اپنی عادت اور معمول کے مطابق زائرین سے ملاقات میں مشغول رہے۔قدرت الٰہی سے ایک سوداگر تازہ انگوروں سے بھرا ایک خوانچہ اور اس کے اوپر سونے کی دو اشرفیاں رکھے بطور نذر لایا۔شیخ نے پوچھا! اے بھائی تو کہاں سے آیا ہے ؟اس نے کہا کابل سے! آپ نے فرمایا تو نے عین کابل میں اس دولا غریب کو یاد کیا تھا یا ابھی؟ تاجر نے عرض کیا کہ یا حضرت! کابل میں ایک رات، جب میں محوِ خواب تھا، دیکھتا ہوں کہ حضرت بدولت تشریف فرما ہیں اور ایک قلندر تازہ انگور اور سونے کی دو اشرفیاں طلب کر رہا ہے۔ جب بیدار ہوا اپنے اوپر نگاہ ڈالی اور (دعا کی) کہ حق تعالیٰ مجھے بخیر و عافیت گجرات تک پہنچا دے تاکہ یہ نذر شیخ کے حضور پیش کرسکوں۔شیخ نے وہ خوانچہ اپنے ہاتھ میں لے کر قلندر کے سامنے رکھا اور فرمایا، اے درویش تیرا یہ رزق کابل سے روانہ ہوا تھا میں منتظر تھا کہ جونہی پہنچے، تیرے حوالے کروں اور تو قبل از وقت اور قبل از قسمت طلب کر رہا تھا اور گرم مزاجی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ان بے شمار تکلیف دہ گالیوں اور لایعنی گفتگو کی، جو تیری زبان شریف سے ہوئی، معذرت کیونکر ممکن ہے؟ اپنا مقصد لے اور وہ قصور جو ہم سے ہوا ہے، فراموش کر دے۔

قلندر ہنسا اور اپنا سر ان کے قدموں میں رکھ دیا اور بولا کہ سرزمین پورب میں یہ نام پتا سنا تھا کہ قصبہ گجرات میں ایک ایسا مردِ خدا موجود ہے، جو کثرت کو وحدت سے ہم رنگ کرتا ہے، اور مجاز کو حقیقت سے ملاتا ہے۔ترک کو تعلق بناتا ہے اور کشف کو رمز اور سخاوت کو نصیب بناتا ہے۔ اس کے تختۂ دل پر اللہ پاک کے سوا کچھ اور رقم نہیں اور جسم عاجزی اور خاک نشینی پر مائل اور نظر افلاک کی بلندیوں پر ہے۔اس بات کی جانچ پرکھ کے لیے اتنا لمبا سفر طے کر کے یہاں تک پہنچا تھا۔آپ کی وسعت نظر اور بلند حوصلے کو جانچنے کے لیے یہ سب ناپسندیدہ دشنام طرازی کی۔جس قدر لوگوں سے سنا تھا اس سے سوگنا زیادہ آپ کے عمدہ اخلاق و خصائل کا مشاہدہ کیا۔اب خدا کے لیے میری بے ادبیوں اور گستاخیوں کو معاف فرمائیں اور مجھے اپنا خاص مرید بنا لیں۔

دریای فراوان نشود تیرہ بہ سنگی

عارف کہ برنجد تنک آبست ہنوز

شیخ نے ازراہ غایت لطف و کرم، اسے کچھ عرصہ اپنے حضور میں رکھا اور اس کے حال پر اپنی عنایات میں روز بروز اضافہ فرماتے رہے۔یہاں تک کہ ان کے فیضان نظر سے اس کے دل کے

آئینے نے صیقل ہو کر جلا پائی اور غیر کا خیال دل سے نکال دیا۔ بعدازاں رخصت ہو کر ہندوستان کو چلا گیا۔ اس وقت اس کی قبر سرزمین سندھ کے قصبے شکارپور میں مردان حق شناس کی زیارت گاہ ہے۔

بھوپت رائے بڈھرہ اور فتح چند کی عاقبت نااندیشی:

جب فتح چند، چند ماہ راجہ گرب سنگھ کی سرکار میں دیوان لگا دیا گیا تو بھوپت رائے بڈھرہ بھی ملازمت کے سلسلے میں اس کے پاس گیا۔ دونوں اجازت کے لیے شیخ کی خدمت میں گئے۔ شیخ نے فتح چند کی جانب روئے مبارک کرتے ہوئے فرمایا کہ بابا فتح چندا! دیکھ جب تک دولا سلامت ہے، ہر گلی کوچے اور میدان سے گھاس پھونس اور لکڑیاں چن کر اپنے دامن میں بھر کے لاتا ہے اور ہر روز اپنا چولہا گرم کرتا ہے لیکن جب دولا نہ رہا، اس چولہے سے اٹھنے والا دھواں بھی نہیں رہے گا۔ اب میں سو سال کی عمر کو پہنچ گیا ہوں اور زمانے کے تمام تلخ و شیریں دیکھ چکا ہوں اور خدا جانتا ہے کہ کب اور کس روز میرا نقارہ کوچ بجے گا۔ غنیمت سمجھتا ہوں کہ اس بڑھاپے کے عالم میں تم جیسے سعادت مند نوجوانوں کو سلامت دیکھوں۔ میرا دل اجازت نہیں دیتا کہ تمہیں خود سے جدا کروں۔

فتح چند نے درخواست کی کہ حضرت ہماری خوش نصیبی ہے کہ آپ کے زیر سایہ رہیں، لیکن آپ بخوبی آگاہ ہیں کہ نوکری کا معاملہ ہے، بہرحال مالک کے سامنے حاضر ہونا ضروری ہے اگر میں نہیں جاؤں گا تو نوکری ختم ہو جائے گی اور اس کے بغیر گھر کی گذران اور کنبے کا پیٹ پالنا محال ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ مولا اسی عزم کو نیک بنائے، لیکن دولا رخصت پر راضی نہیں ہے۔ مزید کہنے سننے کے بعد فتح چند رخصت لے کر چلا گیا تو بھوپت رائے نے رخصت کے لیے درخواست کی۔ شیخ نے فرمایا، بابا بھوپت رائے تم اس زمین کو چھوڑ رہے ہو لیکن یہ زمین تمہیں نہیں چھوڑے گی۔ بہتر تو یہ تھا کہ تم چند روز وطن میں صبر کر لیتے لیکن دانہ پانی جہاں لکھا ہو کھینچ کر لے جاتا ہے۔ دولا تمہیں کیسے روک سکتا ہے، تمہیں کیا پروا؟ خدا کے حوالے، جاؤ۔ بھوپت رائے نے بھی اسی طرح عذر کیے اور جانے کی اجازت لے لی۔

جب یہ دونوں رات کو اپنے گھر میں یکجا ہوئے تو فتح چند نے کہا کہ آج شیخ نے وقت رخصت مجھ پر بہت مہربانی کی اور ایسا فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ مال و دولت کے ساتھ فتح و کامرانی جلد اپنے وطن میں ہی ملے گی۔ بھوپت رائے کہنے لگا کہ شیخ نے مجھے زمین کی بشارت دی ہے۔

میں اس سے یہ سمجھا ہوں کہ مخالفین نے، اس علاقے کے پٹوار کی جس نوکری سے مجھے نکلوا دیا تھا انشاءاللہ وہ دوبارہ بحال ہو جائے گی۔

یہ دونوں شیخ کی باتوں کا اصل مقصد نہ سمجھ سکے اور اپنی آرزو کے مطابق نادرست دلائل سے اپنے دل کو مطمئن کیا اور سفر پر روانہ ہو گئے۔ تقریباً دو سال تک راجہ گرب سنگھ کے دربار میں تمام تر اختیارات اور مراعات سے مستفید ہوئے اور دولت اکٹھی کی۔ قضائے الٰہی سے راجہ فوت ہو گیا اور اس کے قبیلہ کے کچھ لوگ اور راجہ کے پرانے ساتھی جو فتح چند اور اس کے بھائی کی بدسلوکی سے عاجز آئے ہوئے تھے اور موقع کی تاک میں رہتے تھے اس وقت سے فائدہ اٹھایا اور ایک ہی ہلے میں سب کو تہ تیغ کر دیا۔ صرف چند لوگ زندہ بچے جو قیدی بنا لیے گئے تھے۔ فتح چند اور بھوپت رائے جان اور مال دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

جب یہ خبر گجرات پہنچی، حقائق شناس داناؤں نے شیخ کے اس اشارے کی یوں تعبیر کی کہ جب شیخ نے فرمایا تھا کہ ”جب تک دولا زندہ ہے، ہر گلی کوچے اور میدان سے گھاس پھونس اور لکڑیاں اپنے دامن میں چن کر اپنا چولہا جلاتا رہے گا، جب کبھی دولا نہیں رہے گا تو چولہا بھی نہیں جلے گا“ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر فتح چند زندہ رہتا، کہیں سے بھی زر اکٹھا کر لیتا، لیکن جب اس کی زندگی ہی نہ ہوگی تو زر بھی نہیں ہوگا، اس کو جانے سے منع کرنے پر شیخ کا مقصود یہ تھا۔ اور جیسا کہ بھوپت رائے سے فرمایا کہ تم زمین کو چھوڑ رہے ہو لیکن زمین تمہیں نہیں چھوڑے گی، تو اس سے مراد یہ تھی کہ بالآخر سب نے اسی مٹی میں ملنا ہے، پس اسی خاک کو چھوڑ کر تم خواہ کہیں بھی چلے جاؤ، موت تمہیں وہاں بھی نہیں چھوڑے گی۔

شیخ کی اس قسم کی رمزیہ گفتگو اور اشاراتی باتیں بہت ہوتی تھیں، پہلے تو ان کا مضمون اور مفہوم سمجھ میں نہ آتا اور جب وہ وقوع پذیر ہو جاتا ہے تب پتا چلتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے۔ جی ہاں:

مصلحت نیست کہ از پردہ برون افتد کار
ورنہ در مجلس رندان خبری نیست کہ نیست

ملاقات شیخ برخوردار و شاہ مراد قادری و شیخ دولا:

مجھے یاد ہے کہ قدوۃ الابرار، شیخ برخوردار نور اللہ مرقدہ اپنی زبان مبارک سے فرماتے تھے

کہ جب انھوں نے ابتدائے جوانی میں جناب ارشاد بنیاد، فیض مواد حضرت شاہ مراد قادری سے، جو مجھ احقر مخلوق کے والد بزرگوار ہیں، بیعت ہونے کا ارادہ کیا اور سلوک و ریاضت کے طریق پر قدم رکھا تو مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ اگر دنیاوی گفتگو یا ظاہری لہو ولعب کی باتیں سنتا تو لگتا کہ بوئے نجاست نے مشام جاں کی کراہت کو بڑھا دیا ہے۔

ایک روز حضرت شاہ مراد، قصبہ سوق احمد سے، جو ان کا آبائی وطن تھا، سوار ہو کر موضع چک کالو شاہی کی جانب روانہ ہوئے تو میں ان کے ہم رکاب تھا۔ جب ہم گجرات شہر میں شیخ دولا کے پل پر پہنچے، شیخ اپنے حجرے سے باہر تشریف لائے اور حضرت شاہ سے ملاقات کی۔ خدا کی یہ دونوں برگزیدہ ہستیاں وہیں زمین پر بیٹھ کر آپس میں محبت آمیز باتیں کرنے لگیں۔ اسی دوران امرا اور خوانین، مثلاً محبت خان اور آصف خان کا تذکرہ بھی ہوا۔ مجھے ان دو برگزیدہ حضرات کی مجلس میں یہ باتیں ناگوار گذریں۔ میں نے بے ادبی سے باآواز بلند کہا کہ میاں دولا! میں سچی عقیدت کی راہ نمائی میں آپ جیسے مشائخ کی زیارت و ملاقات کو پشاور سے یہاں راستہ طے کر کے پہنچا ہوں۔ افسوس ہے کہ میں آپ جیسے بزرگوں کی زبان سے حق بات سننے کے بجائے انہیں سگانِ دنیا کے تذکرے میں ملوث دیکھوں۔

شیخ نے سر اٹھا کر ایک تند و تیز نگاہ مجھ پر ڈالی اور فرمایا کہ اے درویش، خدا نے میرے باپ کو مارا اور میرے دادا کو ہلاک کیا۔ آج یا کل ہمیں بھی مار دے گا۔ اپنی فکر کرنی چاہیے، کسی کی کیا بات کرنی؟ یہ بات سن کر میری پراگندہ خیالی میں اور بھی اضافہ ہوا مگر پاسِ ادب تھا، کوئی جواب نہ دیا۔ جب حضرت شاہ مراد، شیخ دولا سے رخصت ہو کر گجرات سے باہر آئے تو میں نے عرض کیا کہ میں شیخ دولا کے نام اور ان کی بزرگی سے متعلق دُور سے تعریف و توصیف سنتا تھا لیکن نزدیک سے دیکھا تو ان باتوں کے برعکس نکلا۔ حضرت شاہ مراد نے تبسم کیا اور فرمایا اے فرزند! ہمارے شیخ گروہ رندان طریقت کے سربراہ اور قلندرانِ حقیقت کے مقتدا ہیں۔ رمز و ایماء کا فہم عقل کامل کا متقاضی ہے۔ یہاں فہم ناقص سے کام نہیں چلتا۔

چون بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست
سخن شناس نہ ای دلبرا، خطا اینجاست

میں نے درخواست کی کہ حضرت اپنی ترجمان کرامت زبان کی مدد سے ان باتوں کی

وضاحت فرمائیں تاکہ یہ بدگمانی دور ہو اور یقین آسکے۔ انھوں نے کہا کہ شیخ نے فرمایا "خدا نے میرے باپ کو مارا اور میرے دادا کو مارا، آج یا کل ہمیں بھی مارے گا، اپنی فکر کرنی چاہیے، کسی کی کیا بات کرنا؟" اس کا مطلب یہ ہے کہ آیت کریمہ انا للہ وانا الیہ راجعون [بقرہ، ۱۵۶] کے مطابق اپنے باپ دادا کی حالت پر نگاہ کرنی چاہیے کہ وہ کہاں گئے اور آج یا کل تجھے بھی اسی صورت حال کا سامنا کرنا ہے۔ پس موت کو یاد رکھ کہ موت کو یاد رکھنا ہی درحقیقت حق تعالیٰ کی یاد کا خلاصہ ہے۔ احسن الواعظین موت اخوتکم۔

یہ تعبیر و مفہوم سن کر، جسے بیان کرنے والے اور تعبیر کرنے والے دونوں ہی کامل تھے۔ میرے دل میں شکر اور وجد نے ایسا جوش مارا کہ گویا موت میرے جسم میں موجود ہے اور منکر نکیر میرے سر پر کھڑے ہیں، میزان عدل میں اعمال نیک و بد دونوں پلڑوں میں رکھے ہیں اور بہشت و دوزخ اپنے کام کے لیے تیار ہیں۔ سات روز تک میں اسی دریائے حیرت میں ڈوبا رہا اور کسی بات، کلام، نیند، طعام اور آرام کا یارا نہ رہا۔ سوائے گریہ وزاری، افسوس اور بے قراری کے کچھ نہ سوجھتا۔ بعد ازاں، جب اس بے ہوشی کے اثر میں کچھ کمی آئی تو میں جان گیا کہ شیخ کا مدعائے سخن اور اثر نظر کی کیا کرامات ہیں۔

قطعہ

قدم منہ بخرابات جز بشرط ادب
کہ ساکنان درش محرمانِ بادشہند
غلام ہمت دُردی کشان یکرنگم
نہ این گروہ کہ ازرق ردا و دل سیہند

مصنفؒ کی والدہ کے حال پر شیخ دولا کی شفقت:

میری مشفقہ و مکرمہ و مہربان والدہ کہتی تھیں کہ جب تمہارے والد مجھے بیاہ کر اپنے گھر لائے تو شیخ دولا نے تنبول (سلامی) کے طور پر بہت سی اشیاء عنایت کرنے کے علاوہ ایک روپیہ بھی مرحمت فرمایا اور کہا کہ یہ نقدی میری امام زادی سیدہ کے ہاتھ میں دیں اور کہیں کہ فال دولت ہے۔ ہمیشہ اسے اپنے پاس رکھیں، کبھی بھی رزق و مال میں کمی اور پریشانی نہ دیکھیں گی۔ تمہارے والد نے روپیہ سنار سے ایک انگوٹھی میں تبدیل کروا کر انگوٹھی میری انگلی میں ڈال دی۔ اس وقت

سے اب تک پچاس سال کا عرصہ گذر چکا ہو گا کہ وہ انگوٹھی میرے ہاتھ میں ہے۔ شیخ کے اس تبرک کی برکت سے میں تمام عمر مال دار اور ثروت مند رہی اور قحط وارزانی میں بھی کبھی مجھے رزق کی تنگی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ جی ہاں:

دولتی را کہ نباشد غم از آسیب زوال

بی تکلف بہ درِ دولت درویشان است

عبدالحکیم بڑھئی کے حال پر شیخ کی عنایت:

عبدالحکیم بڑھئی نے ایک روز مجھ سے نقل کیا ہے کہ میں ایک دن شیخ کا کنواں تعمیر کرنے میں مشغول تھا۔ مجھ سے دور، ایک تیر پھینکنے کے فاصلے پر کھڑے، جود وسخا کر رہے تھے۔ شکر و شیرینی، نقد و جنس جو کچھ بطور نذر ایک ہاتھ سے آ رہا تھا، دوسرے ہاتھ سے ایثار کر رہے تھے اور لوگوں میں تقسیم کر رہے تھے۔ میں نے شیخ کی یہ فیاضی اور بخشش دیکھ کر اپنے دل میں حسد محسوس کیا اور اپنے دوستوں سے کہا کہ دولا اپنے دامادوں کو دیتے ہیں اور ہمارے لیے، جو اس قدر محنت و مشقت کرتے ہیں، گویا ان کے ہاتھ خالی ہو جاتے ہیں۔

اس بات کو ابھی ایک لمحہ بھی نہ گذرا تھا کہ شیخ میرے پاس آئے۔ دونوں ہاتھ پر شکر اور اس کے اوپر چار تنکے رکھے ہوئے بولے کہ استاد جیو! نیاز لے لو۔ جب میں نے لے لی تو میرے کان میں بولے کہ اے استاد چونکہ دامادوں کو بیٹیاں دی جاتی ہیں لہٰذا ان سے عزیز کوئی چیز نہیں ہے اور تجھے تیرے نصیب اور قسمت سے زیادہ کس طرح دیا جا سکتا ہے۔ میں نے شیخ کی یہ بات سن کر شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ وہ بے نیازی سے چلے گئے اور لوگوں کو داد و دہش میں مشغول ہو گئے۔

عبدالعزیز بن فتح محمد کی دل جوئی:

عبدالعزیز ابن فتح محمد مرحوم بیان کرتے ہیں کہ میرے والد، مراد قلی سلطان کے بعض سرکاری امور کی انجام دہی کے لیے دارالسلطنت شاہ جہان آباد کے دربار شاہی میں وکیل مقرر ہو کر گئے تھے۔ جب ان امور کے تکمیل سے فراغت پائی اور وطن کو مراجعت کی تو راستے سے ہمیں خط لکھا کہ میں فلاں تاریخ اور فلاں روز بہر صورت، شیخ دولا کے گجرات پہنچ جاؤں گا۔ تمہیں بھی اسی تاریخ کو شیخ کی خدمت میں استقبال کے لیے پہنچ جانا چاہیے تاکہ ہم ایک دوسرے کے دیدار سے مسرور ہوں اور آنکھوں کو نور ملے۔

میں مقررہ میعاد کے مطابق پوٹھوہار سے چار روز کی مسافت طے کر کے گجرات پہنچا اور شیخ کی خانقاہ کی زیارت کی سعادت حاصل کی۔ اتفاقاً میرے والد ابھی شاہ جہان آباد سے دو منزل اِدھر آئے تھے کہ کسی کام کی غرض سے بادشاہ کے ہر کارے انہیں دوبارہ واپس شاہ جہان آباد لے گئے اور ایک ماہ تک انہیں وہاں رکنا پڑا۔ میں نے انتظار سے عاجز اور پریشان ہو کر شیخ کی خدمت میں جا کر درخواست کی کہ حضرت مجھے رخصت دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ آج یہاں رہو، کل تجھے رخصت کروں گا۔ جب کل ہوئی تو میں دوبارہ رخصت کا طالب ہوا۔ وہ میری جھولی میں بہت سی شکر و شیرینی ڈال کر بولے: ''مشرقی سمت والی شاہراہ پر بہت خوبصورت سبزہ زار ہے اور کنویں چل رہے ہیں، جن کی آواز بہت روح پرور اور ہوش ربا ہے، سیر و تفریح کی غرض سے اُس طرف جاؤ اور آج رخصتی کا ارادہ ملتوی کر دو۔'' میں نے ایسا ہی کیا اور مشرقی سمت پر تقریباً دو کوس آگے گیا تھا کہ ایک کنویں پر درخت کے نیچے مجھے اپنے والد صاحب کی سواری کا گھوڑا دور سے نظر آیا۔ حیرت زدہ دوڑتا ہوا وہاں گیا، کیا دیکھتا ہوں کہ میرے والد بیٹھے ہیں۔ انہوں نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا اور میں اشک بار ہو کر ان کے پاؤں پر جھکا۔ ہم شاداں و فرحاں شیخ کی خدمت میں آئے۔ معلوم ہوا کہ آج شیخ نے مشرقی سمت میں بغرض سیر و تفریح جانے کا جو حکم دیا، اس کے پسِ پردہ یہ بات تھی۔

میاں لالا کے لیے شیخ کی دعا اور اس کے ثمرات:

میاں لالا نامی ایک عزیز، قصبہ اٹک میں دریائے سندھ کے پتن پر ''معرفت'' پر مامور تھا اور اس سلسلے میں ہر ناتواں مسلمان کی مدد و حمایت کرتا تھا۔ ''معرفت'' یہ ہے کہ ہر ملک اور ہر سرزمین کا سوداگر اور بیوپاری جب اپنا مال اور سامان لے کر اس پتن سے گذرے تو اس کی ''معرفت'' (پہچان) ہو ورنہ وہ کچہری اور پتن کے کارندوں کی باز پرس اور مواخذہ سے ہرگز خلاصی نہیں پا سکتا اور پریشان حال ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک روز میں شیخ کی خدمت میں گیا اور حسب استطاعت نذر پیش کی۔ باوجود اس کے کہ شیخ نے مجھے اس سے قبل ہرگز نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی کسی نے میرا ذکر ان کے سامنے کیا تھا، ایک شخص سے کہا کہ مخلوق میں خدا کے ایسے بندے بھی ہیں کہ جال میں قید پرندوں کو قید سے آزاد کراتے ہیں اور اڑا دیتے ہیں۔ کس قدر خوش نصیبی اور نیک بختی ہے ان لوگوں کی کہ ان کی سعی سے کئی جاندار رہائی پاتے ہیں۔ میں یہ

بات سن کر سمجھ گیا کہ حضرت میرے بارے میں مہربانی فرما رہے ہیں۔ جانوروں سے سوداگر مراد ہیں اور اٹک کو جال سے موسوم کیا ہے۔ بعد ازاں روئے مبارک میری جانب کیا اور بہت سی اشیاء بطور تبرک عنایت کر کے فرمایا ''اپنے گھر جاؤ اور کابل اور بخارا کے پھل کھاؤ، ہندوستان کا نفیس کپڑا پہنو اور سندھ کا صاف شفاف اور خنک پانی پیو اور تمہاری اولاد ہمیشہ تمہاری آنکھوں کے سامنے رہے۔'' یہ کہہ کر مجھے رخصت کر دیا۔ اس وقت سے اب تک پچاس سال ہو گئے ہیں، شیخ کے وجود فیض اساس کی برکت سے کبھی میں اٹک سے باہر نہ گیا اور ان کے فرمان کے مطابق گھر میں بیٹھے بیٹھے ہی حق تعالیٰ نے میری روزی کا بندوبست کر دیا۔ کسی چیز کی کمی اور پریشانی نہیں ہوئی۔

شیخ دولا کے آخری ایام اور مرض الموت:

شیخ کی عیدگاہ سے متصل مسجد، جہاں پہلے زمین بہت نشیبی تھی اور پانی جمع ہو جایا کرتا تھا، شیخ نے وہاں مٹی ڈال کر اس جگہ کو اونچا کر دیا تھا اور بعض مفلس، فقیر، مساکین اور بے کس لوگ، گھاس پھونس کی جھونپڑیاں بنا کر وہاں رہنے لگے تھے۔ جب میر حسینی نامی گجرات کے فوج دار کو بعض ناحق شناسوں نے ورغلایا تو اس نے وہاں شیخ کی مرضی و رضا کے بغیر غلے کے گودام کی بنیاد رکھی اور غریب لوگوں کو وہاں سے نکال باہر کیا۔ شیخ کو فوج دار کی یہ حرکت اور گستاخی ناگوار خاطر ہوئی۔ راتوں رات پالکی پر سوار ہو کر سیال کوٹ روانہ ہو گئے۔ سات روز وہاں قیام کے بعد دوبارہ گجرات واپس آئے۔ سیال کوٹ میں تمام رات حضرت امام علی الحق رحمۃ اللہ علیہ کے روضۂ اقدس پر معتکف رہے۔

جب علی الصبح روضہ مبارک سے باہر تشریف لائے تو ہاتھ میں یاسمین کے دو تر و تازہ پھول تھے۔ حاضرین نے مؤدبانہ عرض کیا کہ یہ بے موسم کے پھول کہاں سے آئے؟۔ آپ نے فرمایا کہ آج رات امام کی خدمت میں ملتمس ہوا کہ ہماری آسودگی کی غرض سے اپنے جوار میں چند بالشت زمین عنایت فرمائیں۔ انہوں نے حکم دیا کہ وقت قریب آن پہنچا ہے، یاسمین کے یہ دو پھول تبرک لو اور جتنی جلدی ہو سکے گجرات جاؤ کہ تمہاری آسودگی کے لیے اسی مقام کا تعین کیا گیا ہے۔ ان کا یہ فرمانا تھا کہ میں اسی لمحے گجرات کو روانہ ہو گیا۔ سیال کوٹ کے ساکنین رخصت کی سعادت کے منتظر تھے، کیا عورت اور کیا مرد، کیا غنی اور کیا مفلس، یہ خبر سن کر سب عقب میں بھاگے

اور دریائے چناب کے کنارے پر پہنچنے تک خلق خدا اس طرح جمع ہوگئی گویا کوئی عظیم الشان لشکر اکٹھا ہوا ہو۔

شیخ نے موضع میانی ملاحان میں، جہاں حضرت کا لگایا ہوا شہتوت کا ایک باغ ہے، رات بسر کی اور صبح زیارت کے لیے آنے والے تمام لوگوں کو الوداع کہہ کر خود بدولت ایک کشتی میں بیٹھے اور دریا عبور کیا۔ ملاحوں کو بہت سی نقدی و جنس انعام میں دے کر رخصت فرمایا اور گجرات کا رخ کیا اور چاشت کے وقت موضع سوق میں، جو میرا آبائی وطن ہے، تشریف لائے اور اس احقر کے اسلاف کے مقبرے پر پھرواہ کے درخت کے نیچے تشریف فرما ہو کر فاتحہ پڑھی۔ آپ کی کرامت ترجمان زبان سے نکلا کہ اے خلوت کدۂ وصال کا جام نوش کرنے والو اور بادۂ وصال کے سرمستو! ہمارے اور تمہارے درمیان موجود یہ تمام فاصلے مٹنے کو ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ چند ہی ایام میں ہم ایک دوسرے کے جمال سے مسرور ہوں گے۔

گاؤں والے، روسا، رعایا، ہندو اور اہل بازار، سب زیارت کے لیے دوڑے اور جھولی بھر بھر کے نقدی، شیرینی، شکر اور میوہ بطور نذر پیش کیا جو سب ایک سے لے کر دوسرے کو بخش دیا گیا۔ صاحب دلوں کے جان نثار اس فدوی کو بھی حصہ ملا، جو دو گھڑی حضور سے فیض یاب ہوا تھا۔ ایک تھیلا شکر و شیرینی اس فقیر کے حصے میں بھی آئی ہوگی۔

بعد ازاں گجرات روانہ ہو گئے اور پانچ روز صحت و سلامتی سے گذر گئے۔ چھٹے روز اچانک بخار اور اسہال نے حضرت ایشان کو آ لیا اور تیرہ روز تک اس مرض میں مبتلا رہے۔ حکماء اور حاذق اطباء اگرچہ بغرض حصولِ سعادت مختلف مرکبات اور معجون تیار کر کے لاتے تھے لیکن آپ ہرگز کھانے پر آمادہ نہ ہوتے اور فرماتے تھے کہ دولا دوست سے ملاپ چاہتا ہے اور یہ نادان لوگ فاصلے کے اسباب چاہتے ہیں اور زندگی کے لیے کوشاں ہیں اور نہیں جانتے کہ:

زندہ آنست کہ با دوست وصالی دارد

بھاون کو شیخ دولا کی وصیت اور دعا:

اسی اثنا میں بھاون نے، جسے بعض لوگ آپ کا حقیقی بیٹا کہتے ہیں اور بعض کے خیال میں وہ منہ بولا بیٹا ہیں، عرض کیا کہ یہ متبرک گدڑی، جو آپ کو شاہ شیدا سے حاصل ہوئی تھی مجھے عنایت کر دی جائے۔ آپ نے فرمایا کہ اے! تو نے دولا کو خود سے راضی نہ کیا، مولا کو کیسے راضی کرے

گا اور وہ گڈری کپڑے کے سلے ہوئے ٹکڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ہے خواہ تو رکھے، خواہ کوئی اور۔

مغز را ہمراہ خود برداشتیم
استخوان بہر سگان بگذاشتیم

لیکن میں اتنی وصیت کروں گا کہ اگر تو دولا کی قبر پر مجاوری کرے گا تو جو کوئی ہندوستان و خراسان سے اس راہ پر سے گذرے گا وہ چاندی کا ایک سکہ ضرور اس خاکسار کی قبر پر رکھے گا۔ تیری گذر اوقات کے لیے یہی کافی ہوگا اور تجھے رزق کی کمی اور کوئی تنگی نہیں ہوگی اور اگر اپنے اندر غرور و تکبر پیدا کرو گے اور کہیں اور جانا چاہو گے تو پریشان اور بے نوا ہو گے۔

شیخ دولا کا وصال:

یہاں تک کہ بروز پیر، ۱۵ ربیع الاول، ۱۰۸۶ھ میں جام بقا نوش کیا۔ خالی قالب اس دنیا میں رہ گیا اور خود شاہدِ حقیقی کی آغوش میں پہنچ گئے۔ اس واقعہ کی تاریخ ''محبوبِ مولا شیخ دولا'' کے اعداد سے نکلتی ہے۔ آپ کی عمر شریف اندازاً ایک سو دس برس تھی۔

انسانوں میں [آپ کی وفات سے] نوحہ و فغان سے تو ایک قیامت اور ازدہام سے ایک حشر برپا ہو ہی گیا، خانقاہ میں جو درندے، چرندے اور پرندے تھے ان کی چیخ دھاڑ سے گویا پتھر میں دراڑ پڑ رہی تھی۔ [جب پتھروں کا یہ حال تھا تو] دلوں کی کیفیت کیا ہوگی۔ ایک دن رات تک حیوانات نے اپنی خوراک کی طرف منہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

☆☆☆☆

اشاریہ

آیات

احادیث و عربی عبارات

اشعار

آن چہ اندر آئینہ بیند جہان
پیر اندر خشت می بیند ہمان

ص ۱۶

آن خیالاتی کہ دام اولیاست
عکسِ مہ رویانِ بُستان خداست

ص ۲ (مثنوی مولوی، ۱/۷۲)

آئینۂ دل چون شد صافی و پاک
نقشہا بینی برون از آب و خاک
نقش را بینی و ہم نقاش را
فرشِ دولت را و ہم فراش را
چون خلیل آمد خیال یار من
صورتش بت، معنی او بت شکن

ص ۱۲ (مثنوی مولوی، ۱/۷۲-۷۴)

از کران تا بہ کران لشکر ظلم است و لیک
از ازل تا بہ ابد فرصت درویشان است

ص ۳ (دیوان حافظ، ۱۱۶)

اگر قطرہ باران ہمہ دُرّ شدی
چو خر مہرہ بازار ہا پر شدی

ص ۱۴

تا بگرد آن خانہ را در وی نرفت
واندرین خانہ بجز آن حَیّ نرفت

ص ۱۶ (مثنوی مولوی، ۲/۲۲۴۹)

تا هوا رنگِ آفتاب گرفت
رَخت برداشت از میانه ظلام
منجذب گشت قطره در دریا
مانند دریای، قطره شد گمنام

ص ۱۱

چون بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست
سخن شناس نہ ای دلبرا، خطا اینجاست

ص ۱ (دیوان حافظ، ۶۸)

دریای فراوان نشود تیره بہ سنگی
عارف کہ برنجد تنک آبست ہنوز

ص ۳۸

دولتی را کہ نباشد غم از آسیب زوال
بی تکلف بہ در دولت درویشان است

ص ۴۳ (دیوان حافظ، ۱۱۶)

راست روی کن کہ شوی رَستگار
راستی از تو، ظفر از کردگار

ص ۴

روح پاک مولوی عبدالحکیم افسوس و آہ
ملک الا اللہ خوش کرد از جہان لا الہ
کی بر آید چون تو دانشمند بر روی زمین
آسمان گر بر زمین سر می زند تا چند گاہ
از برای ماتم تو می سزد تا روز حشر
گر کلاہ افگندہ بینم از سر خورشید را

حسرت تاریخ و آنکہ بہر تاریخ دگر
"گہ بمدرسہ آیم و گاہ می روم در خانقاہ"

ص ۳۲ (عبدالرحمان جامی گجراتی)

زبان ہای مردانش تیغ قضا ست
نگاہ گدایان تیر خداست

ص ۷

زندہ آنست کہ با دوست وصالی دارد

ص ۴۶

سرشان ببر ز خلق شکر چون مصطفی
کافگند زیر پای ابوجہل طیلسان

ص ۴۷

شنیدم کہ مردان راہ خدای
دل دشمنان ہم نکردند تنگ
ترا کی میسر شود این مقام
کہ با دوستانت خلافست و جنگ؟

ص ۱۳ (گلستان (باب ۲)، ۱۴۶)

گر بہ صورت آدمی انسان بُدی
احمد و بوجہل ہم یکسان شدی

ص ۳ (مثنوی مولوی، ۱/۱۰۲۴)

کارِ پاکان بر قیاس از خود مگیر
گرچہ باشد در نوشتن شیر، شیر

ص ۳ (مثنوی مولوی، ۱/۲۶۴)

مبین حقیر گدایان عشق را کاین قوم
شهان بی کمر و خسروان بی کلهند
ص ۳ (دیوان حافظ، ۴۰۸)

مشو آزرده دل گاہی زدست نا امیدی ہا
کہ صبحی است در پی آخر این شام غریبان را
ص ۷

مصلحت نیست کہ از پردہ برون افتد کار
ورنہ در مجلس رندان خبری نیست کہ نیست
ص ۴۰ (دیوان حافظ، ۱۶۴)

مغز را ہمراہ خود برداشتیم
استخوان بہر سگان بگذاشتیم
ص ۴۷

من با تو چنانم ای نگار چینی [یمنی]
کاندر غلطم کہ من تو ام، یا تو منی
ص ۲ (سخنان منظوم ابوسعید ابوالخیر، ۹۶)

قدم منہ بخرابات جز بشرط ادب
کہ ساکنان درش محرمان بادشہند
غلام ہمت دُردی کشان یکرنگم
نہ این گروہ کہ ازرق ردا و دل سیہند
ص ۴۲ (دیوان حافظ، ۴۰۸)

ہر کہ منظور شد سلیمان را
چو نداند زبان مرغان را؟
ص ۱۸

تاریخی اعلام

(اشخاص، فرشتے، سلاسل)

جغرافیائی اعلام

(ممالک، بلاد، مقامات، عمارات، دریا)

ضمیمہ

یہاں محمد رشید گجراتی کی کتاب جامع الفنون مرتبہ محمد چراغ گیلانی مصنف تذکرۂ شیخ دولا (نسخۂ ذخیرۂ شیرانی، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور، شمارہ 5725/2406) سے چار فارسی خطوط بنام شیخ دولا اور ایک خط بنام محمد چراغ کا متن دیا جارہا ہے (دیکھیے میرا مقدمہ، ص ۲۳)۔ شیخ دولا کے نام تمام خطوط میں محض اظہار عقیدت کیا گیا ہے اور کوئی ایسی بات نہیں لکھی گئی جس سے کسی واقعہ کی طرف اشارہ ہوتا ہو، سوائے اس کے کہ شیخ دولا اپنے احباب اور عقیدت مندوں کو خطوط بھیجتے تھے اور ان سے رابطہ رکھتے تھے۔ یہ خطوط غالباً محمد رشید نے اپنے مربّی شمشیر خان ترین کی طرف سے لکھے ہیں۔ کم از کم پہلے خط سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں خود محمد رشید کا ذکر ہے۔ اس خط کے ساتھ شیخ کی خدمت میں ۲۱ روپے بھی بطور نذر بھیجے گئے۔ محمد چراغ کے نام خط خود محمد رشید کی طرف سے ہوسکتا ہے کیوں کہ اس میں دوستی اور بے تکلفی کی فضا موجود ہے اور ملنے کی خواہش ظاہر کی گئی ہے۔ عارف نوشاہی

(۱)

قبلۂ مقبلان جهان معنی، عارف معارف مولا، حضرت شاه دولا جیو جناب قدسی آیات، قدوسی مآب، خدمت ملایک منزلت، سدره درجت، قدوة العارفین، اسوة المدققین، مقتداء العالمین، حق بین، حقیقت آیین، شناسای سرایر[کذا:اسرار] ربوبیّت، راهبر عالم صمدیّت، اعلم اسرار کونی و الهی، مظهر فیض و رحمت نامتناهی،

مولوی معنوی، حضرت میان صاحب سلمه اللّٰہ تعالیٰ و ابقاه۔ همواره مطرح اشعات انوار رحمانی باد!

تمهید شرایط عقاید و اخلاص و ارادت و صفای طویت در پیشگاه ضمیر همه دان که آینهٔ اشراقات جلایل سبحانی است؛ از آیین عقیدت معنوی بعید می داند، چه هر گاه حقایق عالم ناسوت و ملکوت و جبروت و لاهوت مطرح نظر کیمیا اثر معتکفان آستان عرفان ترجمان، ملایک آشیان باشد، از فرط اخلاص و عقاید و اختصاص نوشتن تحصیل حاصل می بیند۔ امیدوار است که عاکفان کعبهٔ جلال عرفان مآل در خلاصهٔ اوقات فایض البرکات به فاتحهٔ فایحه گشایش جاویدان از حضرت جلّ شانه مستدعی بوده، متضمن حصول سعادات بی پایان باشند۔

درین ولا، دعای فیض انتماء که در مطاوی کرمنامهٔ محمد رشید رقم فیضان یافته بود، باعث افتتاح ابواب رحمت تصوّر داشته، مسرور و خوشدل و شادمان گردید۔ بیست و یک روپیه عجالتهٔ به طریق نیاز درویشان خانقاه، ملایک آرامگاه، سمت ابلاغ یافت۔ والسّلام علی السالکین ومن اتّبع الهدیٰ۔ [۷۶ب-۷۷الف]

(۲)

مهبط فیض نامتناهی، عارج معارج توحید الٰهی، حضرت شاه دولا جیو جناب فیض قباب، قدسی آیات، قدوسی مآب، عارف معارف الٰهی، مهبط فیض نامتناهی، عارج معارج توحید، سالک مسالک، قطب فلک عرفان، غوث دوران، قبلهٔ مقبلان جهان معنی، حضرت میان جیو همواره موطن عارفان و آمادهٔ فیضان رحمت ایزد منّان باد!

بعد از تمهید لوازم نیاز و تسوید شرایط آرزومندی، دریافت

شرف خدمت سراپا سعادت، که مطلب اقصای معتقدان صداقت کیش است، مکشوف ضمیر انور منوّر می گرداند منّت خدای را عزّوجل که حقیقت احوال مخلصان سراپا اعتقاد، بی شایبه تکلّفات صوری به ضمایر قدسی سرایر معتکفان آستان کرامت نشان ظاهر و هویدا است۔

از آنجا که به صدق عقیدت و صفای طویت رسوخ نیست، معتصم به عروه وثقای عنایات فیض سرایت است۔ امیدوار که در همه جا و به همه حال مشتمل تفقّدات عمیمه داشته به فاتحهٔ فایحه، که کلید گشایش آمانی و آمال است، یاد آوری می فرموده باشند۔

زیاده از شوق چه عرض دارد۔ والسّلام علی من التّبع الهدی۔ [ورق ۷۷ب]

(۳)

مرجع مقبلان و مهبط انوار رحمٰن حضرت شاه دولا جیو

بحضرتت چه نویسد که آن ترا شاید

بجز نیاز که آن شیوهٔ محبّان است

آستان ملایک آشیان، قبلهٔ راستان، مظهر تجلیات الٰهی، مصدر فیض و رحمت نامتناهی، کامل الذات ملکی ملکات، حضرت میاں صاحب سلمه اللّٰه تعالیٰ۔ همواره مرجع مقبلان و مهبط انوار رحمٰن باد!

بعد از تمهید شرایط نیاز و تقدیم ضوابط آرزومندی که سرمایهٔ رهنوردان طریق صداقت و عقیدت و اخلاص همان تواند بود، مکشوف ضمیر فیض پذیر که آینهٔ ظهور انوار اسرار و مرآت اشراقات جلوهٔ جمال کردگار است، می گرداند: الحمد اللّٰه ربّ العالمین که حقیقت احوال معتقدان و مخلصان دور و نزدیک بی شایبهٔ تکلّفات

صوری و محاکات ظاهری پرتو انداز معتکفان سدهٔ علیّه است و الّا از شوق دریافت صحبت سراپا سعادت که به اعتقاد آرزومندان این مواهبِ عظمی به منزلهٔ فیض و رحمت کاملهٔ الهی است، حرفی چند به منصّهٔ ظهور می آورد و به نقوش عقیدت و ارادت و اختصاص صفحهٔ کاغذ را رشک افزای جلوه بهار انور روحانی می ساخت۔

ورود نامهٔ سراسر صفا دل عقیدت منزل را نورانی گردانید و صفوتکدهٔ باطنی صفای تازه یافت۔ منّت خدای را عزّ و جل که محبت فطری نیازمند صورت و معنی مظهر جلوهٔ اشراقات قدس گردید۔ از آنجا که آفتابِ جهانتابِ توجهاتِ سامی محیط و شاملِ جهان و جهانیان است، عقیدت سرشت نیز در همه جا و به همه حال امیدوار یاد آوری فاتحهٔ فایحه، که کلید گشایش سعادات دو جهانی و عنایات جاویدانی است، خواهد بود۔

زیاده از شوق و محبت طواف جناب قدسی چه عرض دارد۔ والسّلام علی من اتّبع الهدیٰ۔ [ورق ۷۸ الف-۷۸ ب]

(۴)

قبلهٔ حقیقی و کعبهٔ تحقیقی و طغرای غرّای کرامت رحمت سرمدی حضرت شاه دولا جیو

رباعی

ساقی بیا که یار ز رُخ پرده برگرفت
کار چراغ خلوتیان باز در گرفت
هر بار غم که خاطر ما خسته کرده بود
عیسی دم خدا بفرستاد و برگرفت

منشور لامع النور سعادت ابدی و طغرای غرّای کرامت رحمت

سرمدی که از حجلۀ خلوت پیرای وحدت کالوحی من السّماء جلوۀ ظهور و اشعه بروز یافته، پرده گشای عالم قدس بود، آمادۀ سربلندی و مستعد سجود دایمی ساخت ـ الحمد للّٰه حمداً دایماً که تنومندی بخت سعید و یاوری اوقات فایض البرکات به صد احسنت لبیک گویان با هزاران جان ناتوان شرف استقبال دولت بیعوض عنایات قبلۀ حقیقی کعبۀ تحقیقی مرشد کامل الباقی مدّاللّٰه سبحانه و تعالی ظلال ارشاد دریافت و به امید فیض نسیم صبا غنچۀ افسرده دل بی حاصل برگ و نوا گرفت ـ ذرۀ پامالِ حوادثِ صوری شکر اشعّاتِ انوارِ آفتابِ سعادتِ معنوی به کدام سروسامان برگذارد و وجودِ بی بود نامحمود به عطای این مواهب کبریٰ شایان داند ـ همانا اوقاتِ میمنت سمات باعثی نمی خواهد و عطایای نامتناهی وهبی است و این دولت تعلق به کسب نگرفته و الّا این گرفتارِ هواجسِ نفسانی کجا و فیض دم مسیحا از چه عالم ـ از آنجا که به میامن توفیقات دامن دولت جهان آرایان سریر معانی وسعتی دارد که فرمانروایان هفت اقلیم در یک گوشۀ آن فرمانروایی کنند، خدمت این طایفه رتبۀ ملکی بخشد ـ صحبت این طبقه به عروج مطلب خاص رساند ـ چون به دولت خود متوجهِ حال ذرّۀ بی سر و پا گردیده، هادی شهرستان قدوس شده اند ـ این عطیات نامتناهی از چه عالم شمارد ـ

رباعی

آفتابی تو و منم ذرّه
از ره تربیت مرا بردار
زانکه از ذرّه پروری هرگز
نکند آفتاب تابان عار

[ورق ۷۸ب-۷۹الف]

(۵)

به هدایت وارشاد دستگاه میان محمد چراغ
شاه بی پرواه پناه و امید گاه غلام بی اشباه سلامت!

در این مدّت رنجوری بدنی و نفسانی که نصیب هیچ آفریده نباشد، نغمهٔ جانفزای استفسار احوال تشتت مآل گوش جان را لبریز انبساط نساخت۔ اگرچه به حسب صداقتی که در عناصر فدوی شماست، در عالم معنی نظر بر تصدیع احوال کرده اند، امّا احبای مراسم صورت هم وابسته بذات، ذات الکمالات می داند۔ قیاس باید کرد که این مراتب چون به خود گوارا توان دید؟

فرد

نپرسد شاه، حال مستمندان
چه باشد قال و حال دردمندان

صاحبِ من! این قدر گستاخی از راه تعب و اعتنای طبعی است۔ و الّا الحمدللّٰه که صورةً و معناً مالا مال عنایات شاهی است، بلک چراغ جان ناتوان ازین رهگذر روشن معذور دارندو اگر تصدیع نباشد حسبةاللّٰه به قدوم میمنت لزوم روشنی افزای کاشانهٔ معتقدان باشند۔

زیاده حدّ خود ندیده، امیدوار و چشم به راه انتظار وصول این دولت بی عوض۔

فرد

عمرت از هر چه هست افزون باد
بحرمة النبی و آله الامجاد

[ورق ۱۲۶ ب]

تصاویر

بسم الله الرحمن الرحیم

حمد و ثنای وافره و شکر و سپاس متکاثره مر آفریننده
چار و طبق زمین و آسمان و برآرنده خورش و دانش
و آراینده ماه و خورشید تابان را که بقدرت کامله
مشیت شامله خویش از تمام آفرینش عالم خلاصه
انبیاء آدم را برگزیده در بارگاه ربوبیت و بخلعت
بخشید و انوار حقایق و معارف بحجب تجلیات
جمال و وصال لاریب بر روی دلها بندگان خاص
باز کشید و بحسب حوصلهٔ استعداد و وسعت قابلیت
هر کدام را بدرجات متفاوت فیه رسانیده قومی بمقام علم الیقین
شاد گشت و طائفه بعین الیقین خورسند و جمعی
بحق الیقین مسرور گردید اما این مرتبه و درجه میسر نمی آید
مگر در متابعت دین متین و اقتدای ملت مبین آن
سرور انبیا و خلاصه اصفیا که کرامت کریمه یا نور نوری

تذکرۂ شیخ دولا گجراتی (فارسی) مؤلفہ محمد چراغ قادری
مخطوطہ گنج بخش لائبریری، اسلام آباد، 2678، صفحۂ اوّل

۸٤

در طبقهٔ السان از نوحه و فغان یک تبایتی
برخاست و از اثر و تمام عالم حشری پیدا شد اما از
درنده و چرنده و پرنده که در خانقاه می بودند همه
نعره و آواز بر آمد که و سنگ لاخ رخنه می انداخت
تا به آدمها چه رسد و تا یک شبانروز از غایت
خروش به نوش و خورش سرفرو نکردند
تمام شد هذا الکتاب متبرکه بتاریخ بیست و ششم
ماه کاتک از دستخط خام نویس فقیر حقیر خاکپای
بزرگان عالم نظیر میان محمد حسن علی ساکن [illegible]
تا بجان برای فرمایش و با خاطر درر بحر سخا
و جیهه مکتبه شیخ محمد ثابت السلام لاله داتا رام [illegible]
تحریر یافت سمت ۱۸۹۶ ۹۱۰

هر که خواند دعا طمع دارم — زانکه من بندهٔ گنهگارم

[illegible]

تذکرہ شیخ دولا گجراتی (فارسی) مؤلفہ محمد چراغ قادری
مخطوطہ گنج بخش لائبریری، اسلام آباد، 2678، صفحہ آخر

قبلہ مقبلان جہان نعمت عارف معارف مولانا حضرت شاہ دولا صاحب

جناب قدسیہ آیات قدوسیہ مآب حرمت ملایک منزلت سدرہ درجت
قدوة العارفین اسوة المدققین مقتدار العالمین حق بین حقیقت آئین
شناسای سرایر ربوبیت راهبر عالم احدیت اعلم اسرار کون و الٰهی
مظهر فیض و رحمت نامتناهی مولوی معنوی حضرت میان صاحب سلمہ اللہ تعالی
والقاه همواره مطلع اشعات انوار رحمانی بلا تمهید شرایط عقاید و اخلاص و
ارادت و صفای طویة در پیشگاه ضمیر همه دان کہ آئینه اشراقات جلایل
سبحانی است از آئین عقیدت معنوی بعید میداند چه هرگاه حقایق عالم
ناسوت و ملکوت و جبروت و لاهوت مطمح نظر کیمیا اثر معتکفان
آستان عرفان ترجمان ملایک آشیان باشد از فرط اخلاص و عقاید و
اختصاص نوشتن تحصیل حاصل می بیند امیدوار است کہ عاکفان
کعبه جلال عرفان مآل در خلاصه اوقات فایض البرکات بفاتحه فایحه
کتب لیس جاویدان از حضرت جل شانه مستدعی بقیه متضمن حصول سعادات
ابد بایان باشند در نیولا دعای فیض اشتمال کہ در مطاوی کرمنامه محمد رشید
رقم فیضان یافته بود باعث افتتاح ابواب رحمت تصور گشته مسرور
و خوشدل و شادمان گردیده است و دیگر به عجالة الطریق نیاز درویشان

خط بنام شیخ دولا گجراتی، مندرجہ جامع الفنون
مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور، 5725/2406

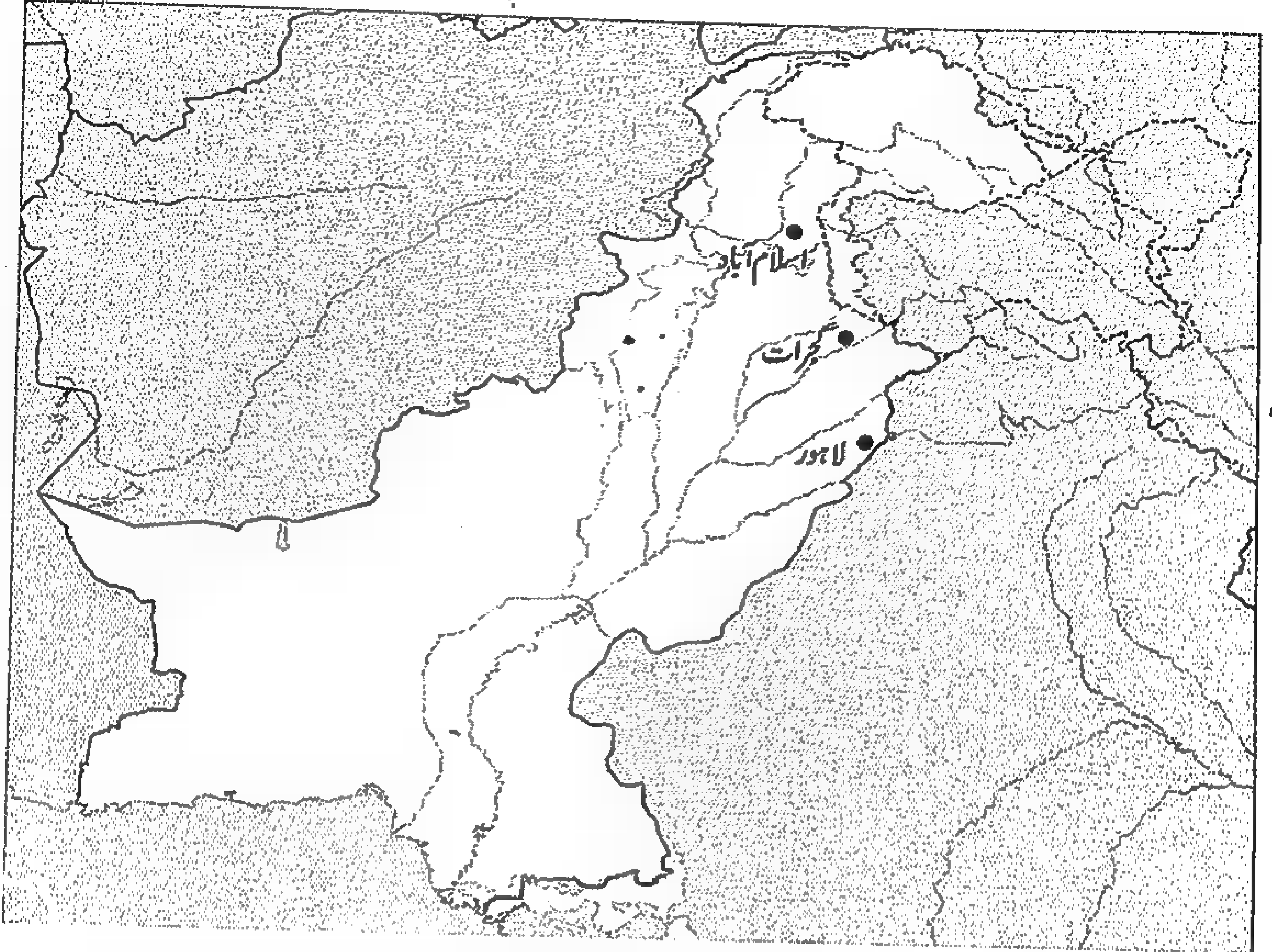
امید که بسلامت و صحتکامی کامروا در جهانی و جهانیان باشند

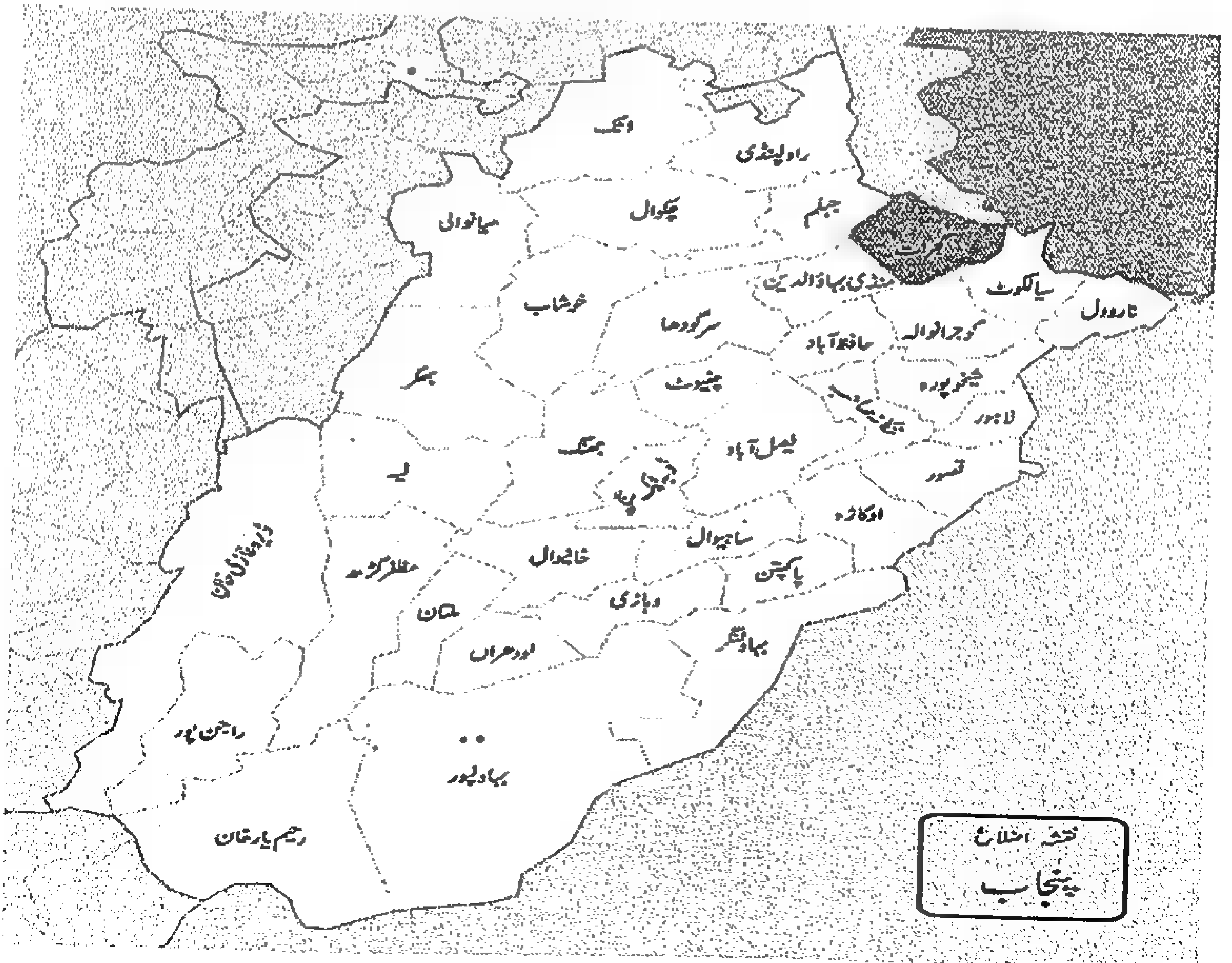
به هدایت و ارشاد دستگاه میان محمد چراغ

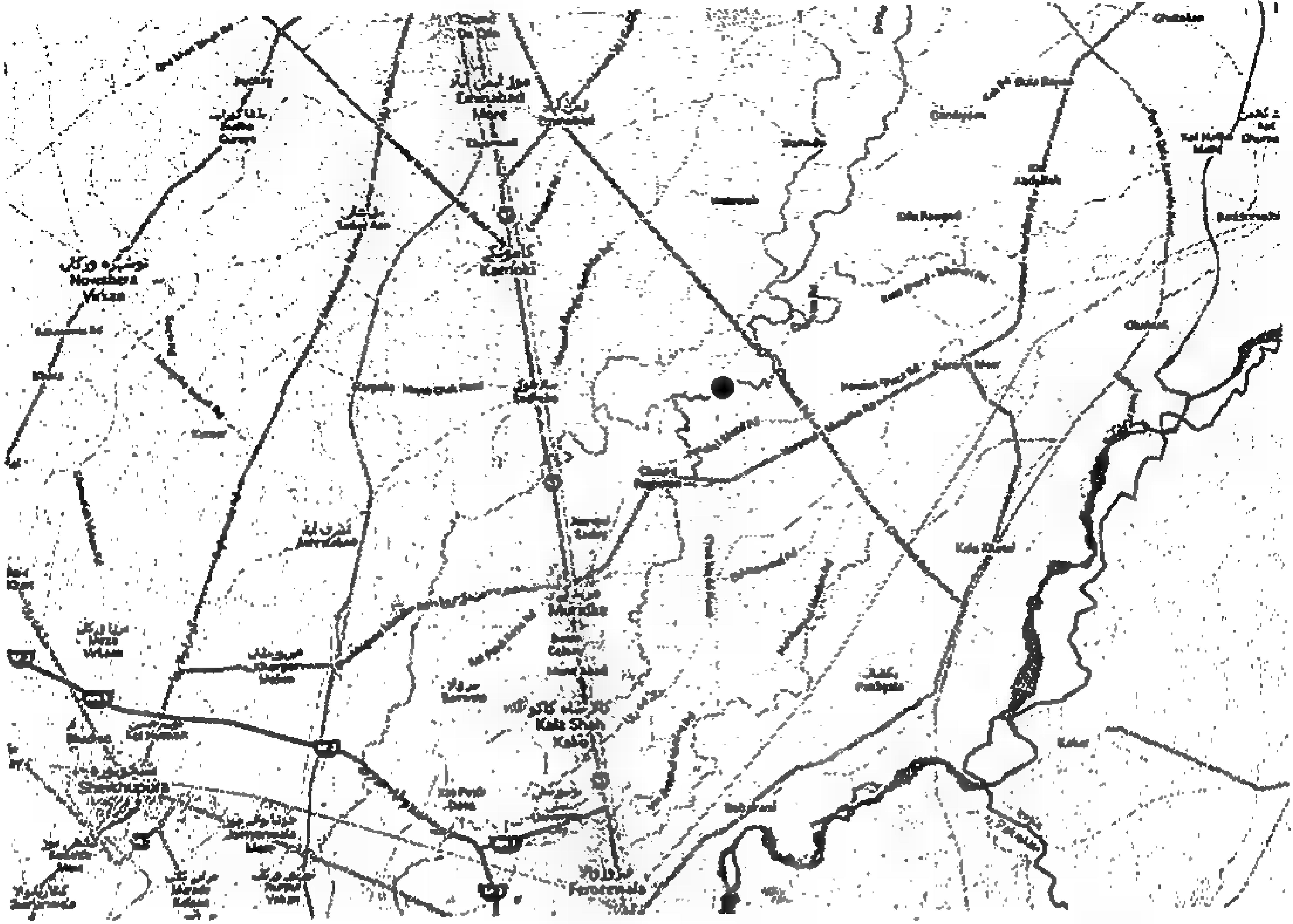
شاه پناه برادر پناه و امیدگاها غلام پناه ارشاه سلامت در بهجت رنجوری
بدیند و لفافه نصیب بهجت افزا رسید یعنی نغمه جانفزای استفسار احوال
نشست مالکونش جانب ابریزه انبساط ساخت اگرچه بحسب صداقتی
که در عناصر قدسی نجابت در عالم معنی نظر بر تصدیع لصوابی که ده ایذا
احبابی مرسم صورت هم وابسته بذات ذات الکمالات مبدا ایذا قیاس
باید کرد که اثرات جهنی بحضور کو اراتوان دید فرد نیز رسید شاه حالت ستمدیدان
چه باشند قال و حال دردمندان ... صاحبا اینقدر کشیده ازرسال تعب و اعتنا
طبع لطیف والا الحمدلله که صورتا و معنا مالامال عنایات شاهی است بلکه
چراغ جان ناتوان ازین رهگذر روشن معذور دارند که اگر تصدیع نباشد
حسبة لله به قدم میمنت لزوم روشنی افزای کاشانه معتقدان باشند
زیاده حد خود ندیده امیدوار و چشم براه انتظار وصول ایذا دولت همچو صبح
فرد عشرت از هر چه هست افزون باد ... بحرمة النبی و آله الامجاد

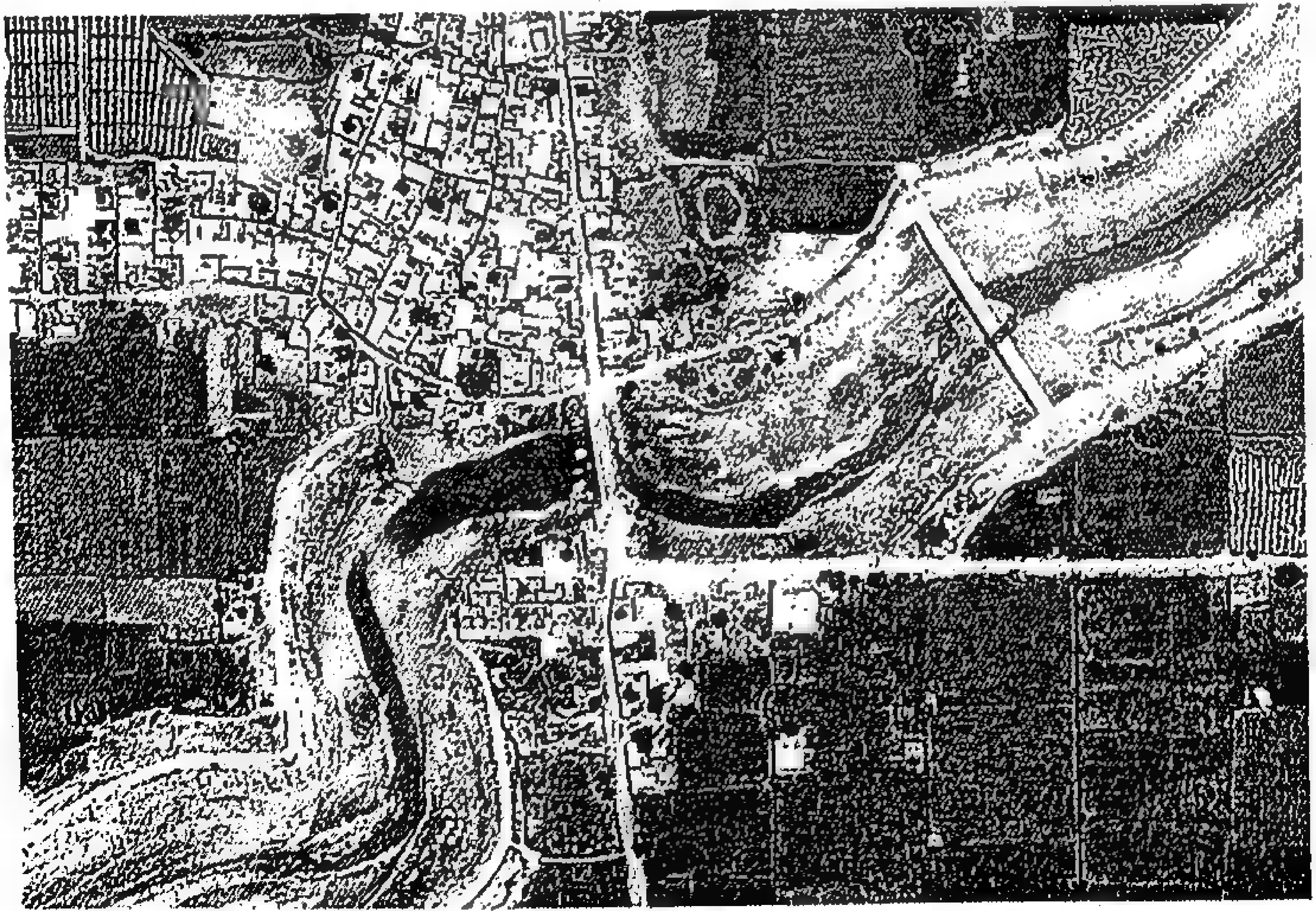
به مستجاب شیخ عبدالخالق

خط بنام محمد چراغ قادری، مندرجہ جامع الفنون
مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور، 5725/2406

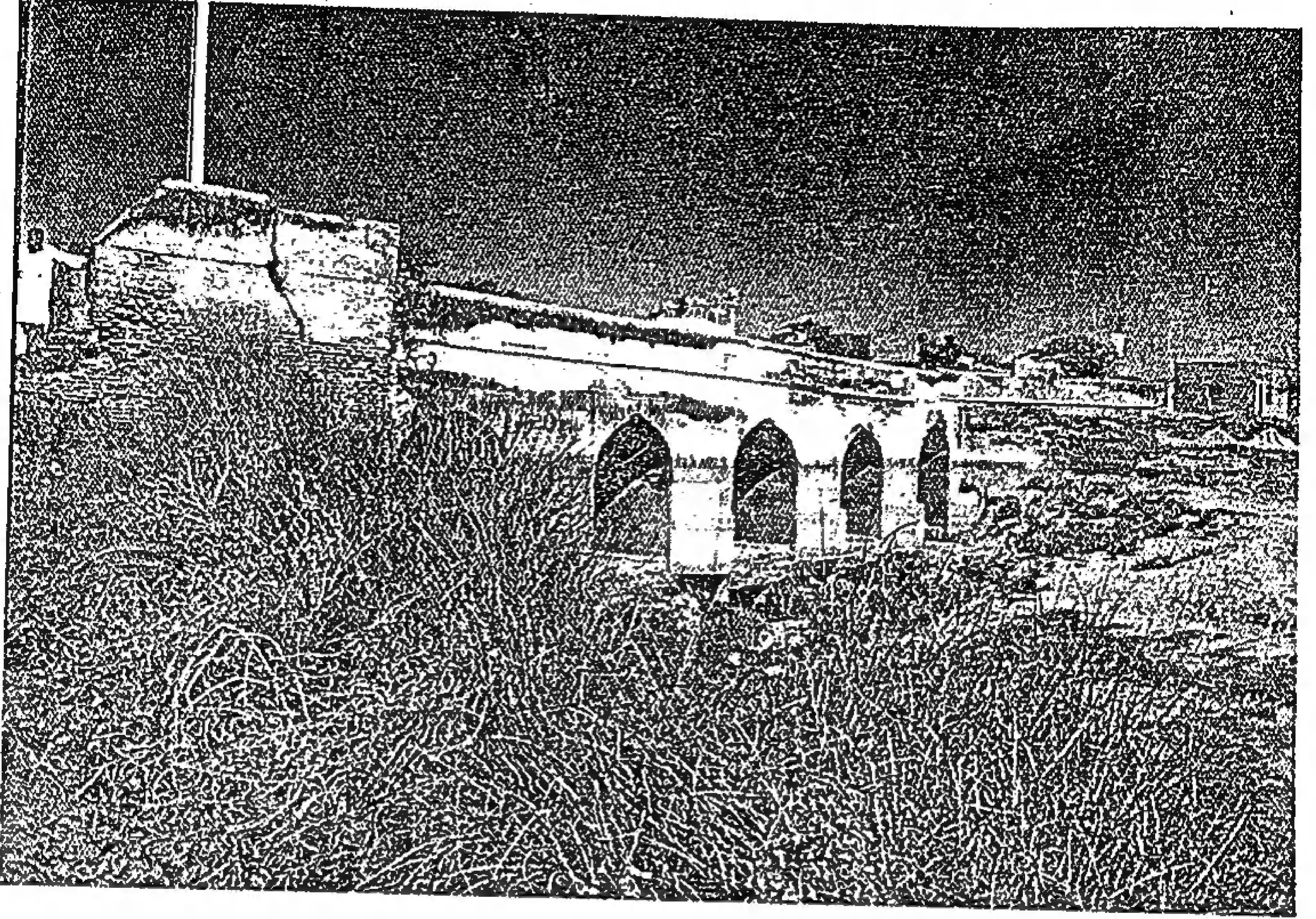

اسلام آباد
گجرات
لاہور

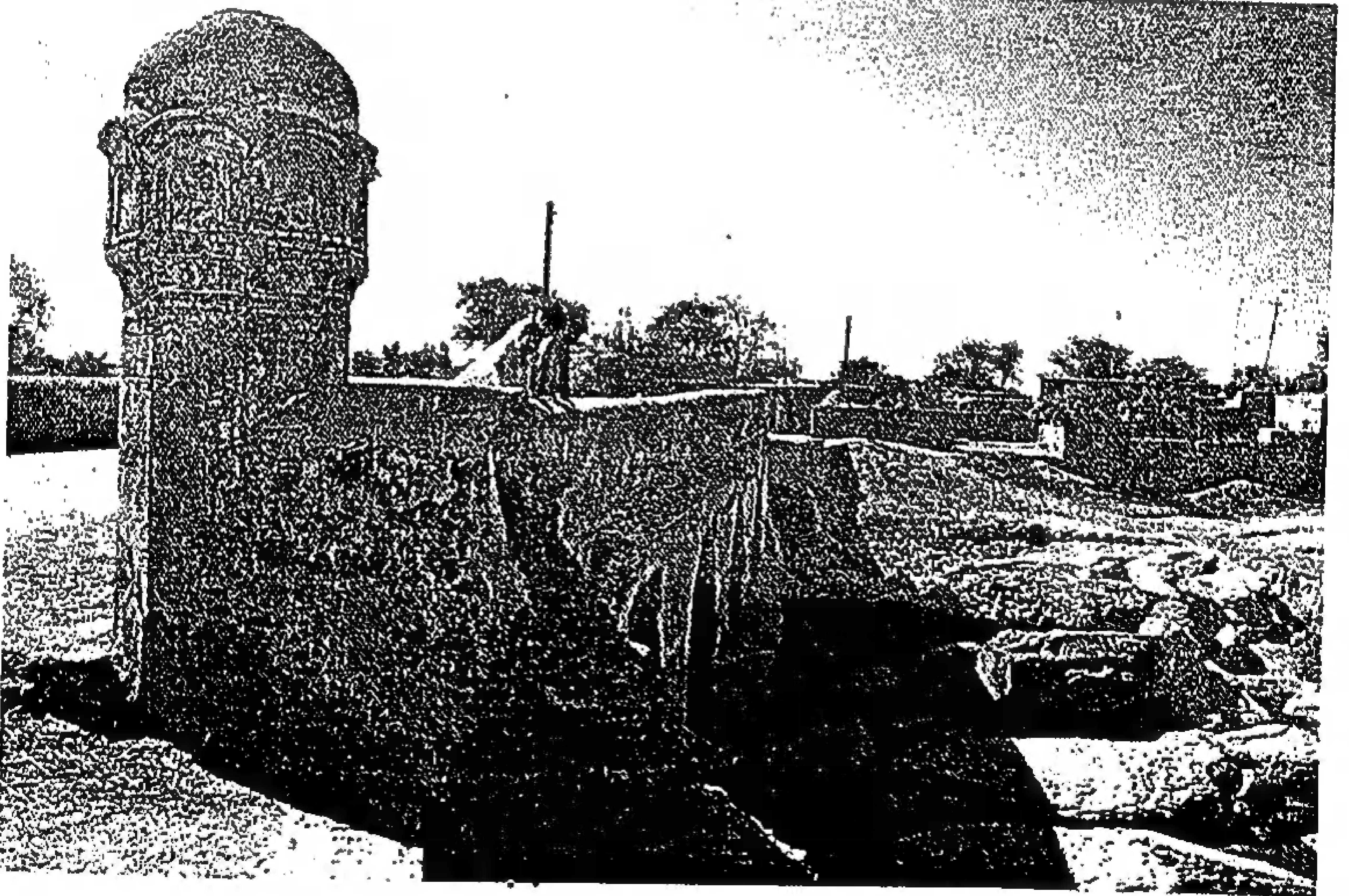

اٹک
راولپنڈی
میانوالی
چکوال
جہلم
گجرات
منڈی بہاؤالدین
سیالکوٹ
نارووال
خوشاب
سرگودھا
حافظ آباد
گوجرانوالہ
بھکر
چنیوٹ
شیخوپورہ
لاہور
جھنگ
فیصل آباد
لیہ
قصور
اوکاڑہ
ڈیرہ غازی خان
مظفر گڑھ
خانیوال
ساہیوال
پاکپتن
وہاڑی
ملتان
لودھراں
بہاولنگر
راجن پور
بہاولپور
رحیم یار خان
نقشہ اضلاع
پنجاب





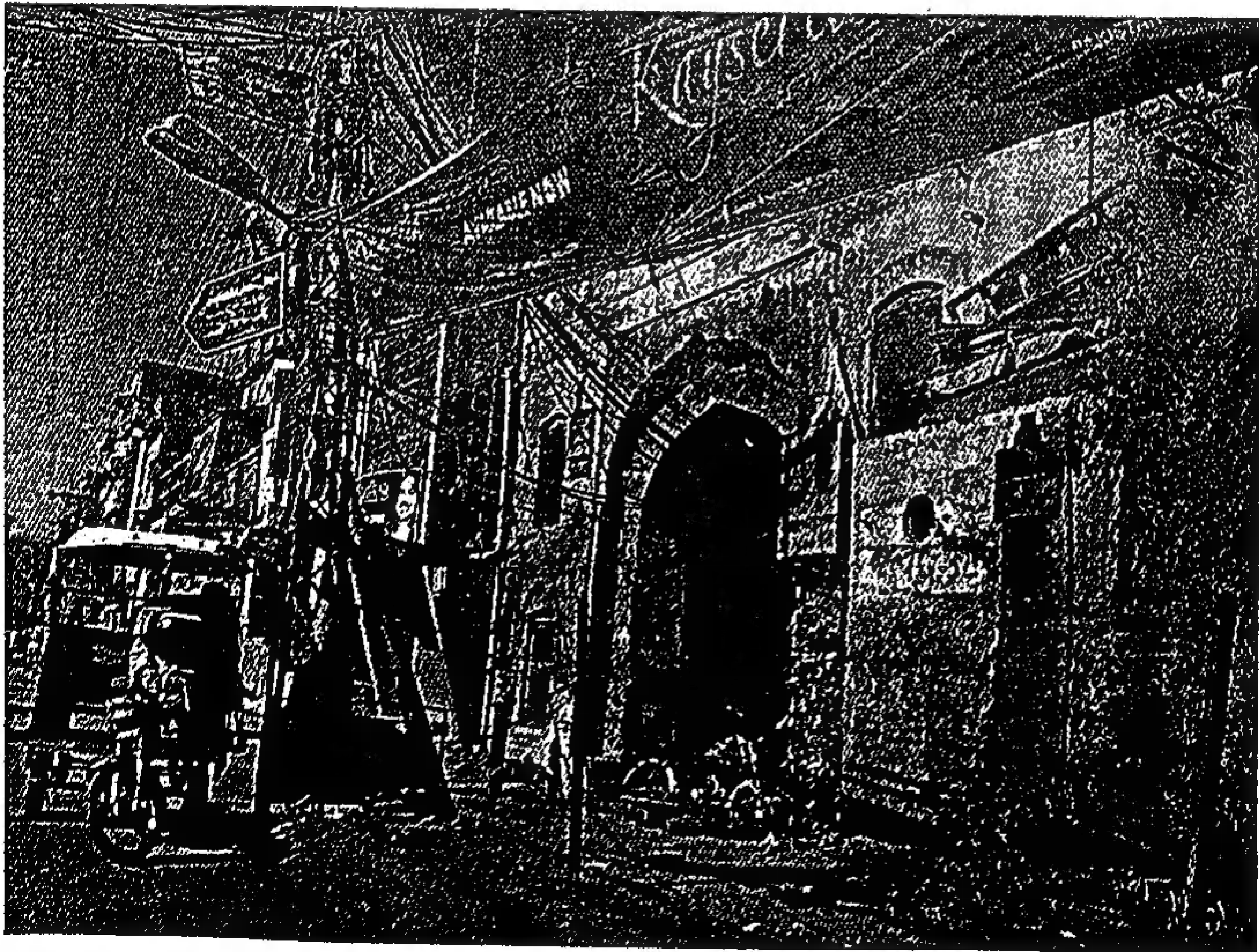
[پل شاہ دولا] تعمیر کردہ شیخ دولا گجراتی، یہ پل بیس کلومیٹر شمال مغرب قصبہ مرید کے میں ابھی تک موجود ہے
یہ پل جس نالے پر تعمیر شدہ ہے اُس کا نام نالہ ایک یا دیوگہ ہے



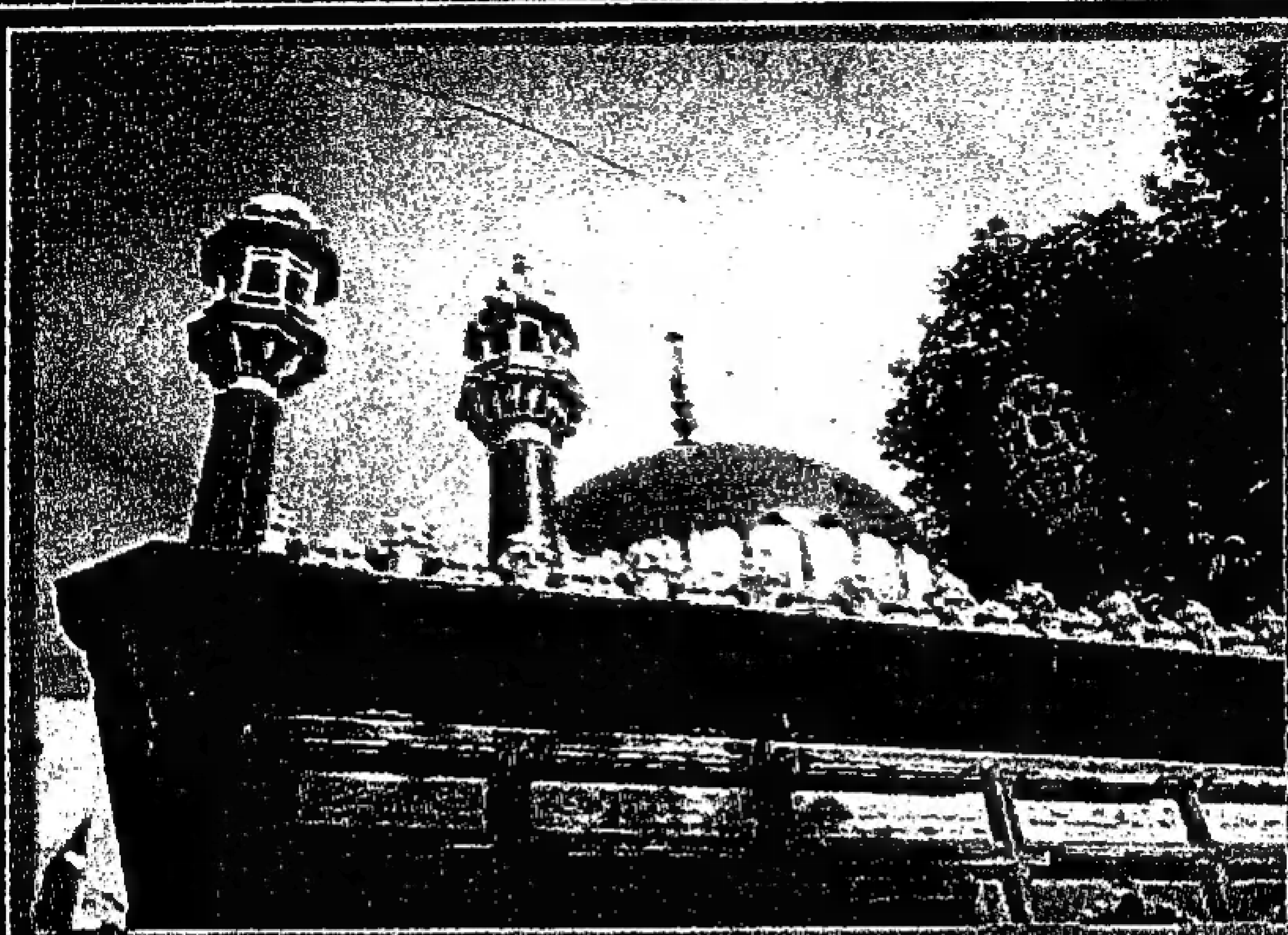


[پل شاہ دولا] تعمیر کردہ شیخ دولا گجراتی، یہ پل بیس کلومیٹر شمال مغرب قصبہ مریدکے میں ابھی تک موجود ہے
یہ پل جس نالے پر تعمیر شدہ ہے اُس کا نام نالہ ایک یا دیوگہ ہے





شاہ دولا دروازہ، گجرات



پنجاب کے نامور صوفی اور مجذوب حضرت شاہ دولا گجراتی (وفات: ۱۰۸۶ھ / ۱۶۷۵ء) کے حالات پر محمد چراغ بن شاہ مراد گیلانی قادری کا یہ تذکرہ حضرتِ موصوف پر قدیم ترین دستیاب ماخذ ہے۔ خود مصنف اور اس تذکرہ کے اکثر روایت کرنے والے حضرت شاہ دولا سے ملاقات کر چکے تھے اور ان کے احوال و مقامات سے واقف تھے۔ مصنف سوانح نگاری میں اپنا ایک منفرد اسلوب رکھتے ہیں اور انھوں نے حضرت شاہ دولا کے سوانحی تفصیلات ایک مافوق الفطرت شخص کے طور پر پیش نہیں کیے، بلکہ ان کے مثالی کردار کے خدوخال کو اجاگر کیا ہے۔ پنجاب کے دیگر معاصر علما اور شعرا پر معلومات، اس تذکرے کی اضافی خوبی ہے۔

المیر ٹرسٹ لائبریری و مرکز تحقیق و تالیف

میر سٹریٹ بھمبر روڈ، گجرات (پاکستان)